جلد 6 شمارہ 2,3

مئی تا دسمبر 2013

چیلنج

ایڈیٹرز: عذرا طلعت سعید/صبیحہ حسن

...' یہ خون بولے گا۔

سال 2013 عوامی حقوق کے حصول اور ذمہ داریوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے حوالے سے سخت رہا۔ اس سال سامراجی اور استحصالی طاقتوں نے اپنے آپ کو مضبوط، مربوط اور پھیلانے کی کوششوں کو نہ صرف تیز کر دیا بلکہ کامیابی کی کچھ منزلوں کو بھی حاصل کیا۔ عوام اور کسان دشمن ادارہ ڈبلیو ٹی او 1999 سے لیکر 2005 تک اپنے کسی بھی وزارتی اجلاس کو کامیاب نہیں کروا سکا تھا۔ ایک طرف مزاحمتی تحریکوں نے ہر ممکن رکاوٹ ڈال رکھی تھی، دوسری طرف تیسری دنیا کے رکن ممالک بھی اپنے موقف پر ڈٹ کر پہلی دنیا کے غیر منصفانہ مطالبوں کو رد کرتے رہے تھے۔ لیکن 2013 میں ڈبلیو ٹی او کے نویں اجلاس میں سرمایہ دار ممالک اپنے کالے منصوبوں کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوگئے۔ عوامی تحریکوں کے لیے یہ ایک شدید لمحہ فکر یہ ہے۔

سال 2013 پاکستان کی حکومت اور عوام کے لیے تبدیلی لیکر آیا۔ پہلی دفعہ کسی حکومت نے اپنی پانچ سالہ مدت پوری کی۔ پچھلے چند ماہ کی نئی نویلی حکومت نے اب تک کیا رنگ دکھائے ہیں؟ افسوس ہے کہ نیو لبرل پالیسیوں، جن میں ڈی ریگولیشن، نجکاری اور آزاد تجارت شامل ہیں، کے اطلاق میں نواز حکومت نے پھرتی دکھائی ہے اور آئی ایم ایف کے دباؤ میں 31 اداروں کی نجکاری کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

بجٹ 2014-2013 ہمارے حکمرانوں کے ارادوں کا آئینہ دار ہے، جس کے تحت حکومت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ سرکاری اثاثوں کو بیچ کر حاصل کیا جائے گا۔ بجٹ میں پیداواری شعبہ جات کو یا تو نظر انداز کیا جارہا ہے یا پھر ان کے لیے ایسا طریقہ کار اپنایا جارہا ہے جس سے آزاد تجارت کی پالیسی کے تحت برآمدی منصوعات کی پیداوار کو فروغ حاصل ہو۔ یقیناً پاکستان کی حکومت برآمدات پر زور دے گی کیونکہ وہ زرمبادلہ کما کر سامراجی حکومتوں اور اداروں سے لیے گئے قرضوں کو واپس کرنے پر مجبور ہے۔ بجٹ کے مطابق ہمارے کل اخراجات کا زیادہ تر حصہ صرف قرضوں کی ادائیگی اور دفاعی خرچوں کو پورا کرنے کے لیے مختص ہے۔ جبکہ کسی بھی قوم کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب وہ خود انحصاری کے اصولوں کو اپنائے لیکن ایسا کوئی ارادہ حکومت کی ترقیاتی پالیسیوں میں نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں نجکاری اور آزاد تجارت کو مذہبی فرائض کا درجہ دیا جارہا ہے جس کے نتیجے میں عوام بے روزگاری اور مہنگائی کے ہاتھوں بھوک اور مفلسی کی ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور ہیں بشرطیکہ وہ ظلم کے ان ہتھیاروں کے خلاف ڈھال بن کر کھڑے نہ ہو جائیں۔ سامراج سمجھ گیا ہے کہ نہ صرف اشرافیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ ضروری ہے بلکہ اب مقامی آبادیوں کو بھی ساتھ ملایا جارہا ہے۔ سامراجی ادارے ایسے نام نہاد ترقیاتی پروگرام چلا رہے ہیں جن سے ہمارے مزدور اور کسان کارپوریٹ طریقہ پیداوار کے لیے تیار ہوسکیں۔ کسانوں اور مزدوروں کے لیے ایسی تربیتی پروگرام ترتیب دیے گئے ہیں کہ وہ روایتی طرز پیداوار سے ہٹ کر جدید صنعتی طریقہ زراعت کی طرف راغب ہو جائیں۔

کیا کسان اور مزدور اس جھانسے میں آجائے گا؟ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ ملک میں پیداواری طاقت نجی شعبہ کے حوالے کرکے آسودہ حال زندگیاں گزاری جاسکتی ہیں؟ ملک میں شدت سے بڑھتی ہوئی مہنگائی اور پے درپے مسائل کا، جن میں موسمی اور توانائی کا بحران شامل ہیں مقابلہ نجکاری اور آزاد تجارت سے ممکن ہے؟ یا پھر اصل جواب مزدور و کسان کا پیداواری وسائل پر کل اختیار ہے؟

راستہ صرف مزاحمت اور جدوجہد کا ہے۔ ہر حال میں مفلسی میں جھونکے گئے عوام کو اپنی اور آنے والی نسلوں کی بقاء کے لیے ان استحصالی قوتوں سے اپنے حقوق کے لیے جنگ کرنی پڑے گی۔

فہرست مضامین

عالمی تجارت کا گورکھ دھندا 2	بجٹ 2013-14 میں زرعی خرچوں پر نظر.. 21
پاکستان میں نجکاری اور آزاد تجارت 9	بات تو سچ ہے مگر 35
آسٹریلوی ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقی 13	رخ زمانہ 39

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے
میزریور کے تعاون سے شائع کیا ہے۔
سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون: 0092 21 3481 3320 فیکس: 0092 21 3481 3321
ای میل: roots@super.net.pk

عالمی تجارت کا گورکھ دھندہ: ڈبلیو ٹی او کا نواں وزارتی اجلاس

تحریر: ولی حیدر

ڈبلیو ٹی او کا قیام 1995 میں عمل میں آیا جو کہ پہلے گیٹ (جنرل ایگریمنٹ آن ٹریڈ اینڈ ٹیرف/GATT) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے قریب بریٹن ووڈ کانفرنس میں، جو کہ 1944 میں ہوئی، تین عالمی اداروں کے قیام پر سوچ بچار کی گئی۔ ان میں آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور آئی ٹی او (انٹرنیشنل ٹریڈ آرگنائزیشن) شامل تھے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک 1945 میں قائم کردیے گئے مگر آئی ٹی او کے بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہوسکا، اس لیے امریکہ، برطانیہ اور چند دیگر ممالک نے مل کر 1947 میں گیٹ کا قیام عمل میں لایا، جسے جنوری 1995 میں تبدیل کرکے ڈبلیو ٹی او کی شکل دی گئی۔

اب تک 159 ممالک ڈبلیو ٹی او کے ممبر بن چکے ہیں۔ ڈبلیو ٹی او کے اہم معاہدوں میں عالمی زرعی معاہدہ (اے او اے/AoA)، ذہنی ملکیت کا معاہدہ (ٹرپس/TRIPS) اور تجارت کے حوالے سے خدمات کا معاہدہ (گیٹس/GATS) شامل ہیں۔ چیلنج کے پچھلے شماروں میں ان معاہدوں کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اب تک ڈبلیو ٹی او کے مجموعی طور پر نو وزارتی اجلاس منعقد ہو چکے ہیں جن کی تفصیل نیچے دی جارہی ہے:

پہلا	1996	سنگاپور
دوسرا	1998	جنیوا، سوئٹزرلینڈ
تیسرا	1999	سیاٹل، امریکہ
چوتھا	2001	دوحہ، قطر
پانچواں	2003	کین کون، میکسیکو
چھٹا	2005	ہانگ کانگ
ساتواں	2009	جنیوا، سوئٹزرلینڈ
آٹھواں	2011	جنیوا، سوئٹزرلینڈ
نواں	2013	بالی، انڈونیشیاء

اوپر بیان کئے گئے وزارتی اجلاسوں میں سے چند اہم اجلاسوں کی تفصیلات مختصراً نیچے بیان کی جارہی ہیں۔

تیسرا وزارتی اجلاس: سیاٹل، 1999

1999 کے سیاٹل وزارتی اجلاس میں ڈبلیو ٹی او کو اس وقت سب سے پہلا اور بڑا جھٹکا لگا جب ترقی پذیر ممالک جنہیں تیسری دنیا بھی کہا جاتا ہے، کی حکومتوں اور عوامی تحریکوں نے مل کر اسے ناکام بنا دیا۔

سیاٹل میں پہلی دفعہ ڈبلیو ٹی او کے خلاف ایک سخت اور منظم ردعمل دیکھنے میں آیا۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے کسانوں، مزدوروں اور عوام دوست تنظیموں نے یک زبان ہوکر اس عالمی ادارے کے استحصالی ایجنڈے کو ماننے سے انکار کردیا۔ باہر سڑکوں پر موجود لاکھوں مظاہرین نے اندر مذاکرات میں مصروف ترقی پذیر ملکوں کو یہ ہمت دی کہ وہ بھی اپنے حق کے لیے ڈٹ جائیں۔ یہ کھلی حقیقت ہے کہ اگر سیاٹل میں لاکھوں افراد سڑکوں پر ڈبلیو ٹی او کے خلاف جمع نہ ہوتے تو سیاٹل وزارتی اجلاس بھی کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہوجاتا۔

ترقی پذیر ممالک یعنی تیسری دنیا نے مندرجہ ذیل وجوہات کی بنیاد پر مذاکرات کو ماننے سے انکار کردیا:

1۔ جب چھوٹی معیشتوں (کمزور معیشت کے حامل ممالک) کی ایک بڑی تعداد نے نام نہاد گرین روم میں ''خفیہ'' طور پر فیصلہ سازی کے عمل کو ماننے سے انکار کردیا۔

2۔ جب تیسری دنیا کے چند ممالک نے ڈبلیو ٹی او میں زرعی برآمدات کرنے والے ملکوں پر مشتمل کینز گروپ اور امریکہ کو زرعی شعبے میں مزید مراعات دینے سے انکار کردیا۔

3۔ جب تیسری دنیا کے ممالک نے امریکی انتظامیہ سے مرعوب ہوئے بغیر تجارتی حقوق، ذمہ داریاں اور پابندیوں کو مزدوروں کی ذمہ داریاں اور حقوق کے لیے بنائے گئے معیار اور ماحولیاتی معیار کو نتھی کرنے کو ماننے سے انکار کردیا۔[1]

چوتھا وزارتی اجلاس: دوحہ، 2001

سیاٹل وزارتی اجلاس کی ناکامی عوامی حقوق کی جدوجہد کرنے والے گروہوں کے لیے ایک خوش آئند پہلو تھا۔ اس کی ناکامی سے ثابت ہوا کہ سیاسی و مزاحمتی تحریکیں، ڈبلیو ٹی او کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کو دنیا بھر میں مسلط کرنے کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔

2001 کے چوتھے وزارتی اجلاس کو ایک جزوی کامیاب اجلاس کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ دوحہ، قطر میں اس اجلاس کو منعقد کرنے کا مقصد سیاٹل وزارتی اجلاس کے موقع پر بڑی تعداد میں عوامی تحریکوں اور مظاہرین کی موجودگی کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا، جو کہ سیاٹل وزارتی اجلاس کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ تھی۔ چونکہ قطر میں داخلے اور ویزے کے پیچیدگیوں کی وجہ سے بڑی تعداد میں عام

افراد کا داخلہ انتہائی مشکل ہے۔ اس لیے چوتھے وزارتی اجلاس کے لیے دوحہ کا انتخاب کیا گیا۔ اس اجلاس کے نتائج کو ''دوحہ اعلامیہ'' (Doha Declaration) کا نام دیا گیا۔ اس اجلاس کے دوران عالمی تجارت کی بحث میں پہلی دفعہ تجارت کے ساتھ ترقی کے پہلو کو بھی منسلک کیا گیا۔ سیاٹل میں ناکامی کے بعد پہلی دنیا کے ممالک نے پہلی دفعہ ترقی پذیر ممالک کے تحفظات پر سنجیدگی سے غور کیا۔ مثال کے طور پر ڈبلیو ٹی او کے مختلف معاہدوں مثلاً ٹرپس کو لاگو کرنے میں تیسری دنیا کے ممالک کو درپیش مسائل اس کی تشریح اور ٹرپس کا دوسرے بین الاقوامی معاہدوں سے تعلق مثلاً حیاتیاتی تنوع پر کنونشن (Convention on Biodiversity)۔

گرین باکس

گرین باکس کے ذریعہ ملکوں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنے زرعی شعبہ یا کسانوں کو براہ راست رقم دے کر مدد فراہم کرسکتے ہیں جو کہ تجارت کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔

دوحہ وزارتی اجلاس میں زراعت پر ممبر ممالک کے اختلافات کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی گئی اور ایک ایسے نتیجے میں پر پہنچنے کی کوشش کی گئی کہ جو تمام فریقین (پہلی دنیا اور تیسری دنیا کے ممالک) کے لیے قابل قبول ہو، کیونکہ ڈبلیو ٹی او نام نہاد اتفاق رائے کی بنیاد پر فیصلہ سازی کرتا ہے۔ اس حوالے سے چند اہم نکات جن پر اتفاق رائے کی کوشش کی گئی، درج ذیل ہیں:

- کیا برآمدی مراعات کا خاتمہ کردیا جائے؟
- کیا برآمدی مراعات کے خاتمہ کے بدلے تجارت کی راہ میں حائل دیگر رکاوٹوں اور مراعات مثلاً برآمدی امداد اور غذائی امداد کو نظم و ضبط میں لایا جائے؟
- کیا گرین باکس کے ضمن میں دی گئی مراعات کی حد مقرر کی جائے؟

دوحہ اعلامیہ میں اس ارادے کا بھی اظہار کیا گیا تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک سے خصوصی اور مختلف برتاؤ (Special and Differential Treatment/SDT) کیا

ترقی یافتہ ممالک (پہلی دنیا) اور ترقی پذیر ممالک (تیسری دنیا)

ڈبلیو ٹی او میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کی کوئی تشریح بیان نہیں کی گئی ہے۔ یہ ممالک پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو کس گروپ میں شامل کرواتے ہیں مثال کے طور پر پاکستان اپنی مرضی سے فیصلہ کرے گا کہ وہ ترقی یافتہ ملکوں کے گروپ میں شامل ہونا چاہتا ہے یا ترقی پذیر ممالک کے گروپ میں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر کسی متعلقہ گروپ کے کسی ملک کو اعتراض ہو تو وہ ڈبلیو ٹی او کی ڈسپیوٹ سیٹل منٹ باڈی (Dispute Settlement Body) میں اپنے اعتراضات داخل کرسکتا ہے کہ اس ممبر کو ان وجوہات کی بنیاد پر اس گروپ کا ممبر نہیں ہونا چاہیے۔

Source: World Trade Organization. "Who are the developing countries in the WTO", accessed from www.wto.org/english/tratop_e/devel_e/d1who_e.htm

جائے کیونکہ تیسری دنیا کے ممالک کی ضرورتیں اور صلاحیتیں پہلی دنیا کی ضرورتوں اور صلاحیتوں سے مختلف ہیں۔ SDT (ایس ڈی ٹی) کا مقصد تجارت کے حوالے سے تیسری دنیا کے ممالک کے مفادات کو ترجیح دینا تھی۔

دوحہ وزارتی اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ جب تک ممبران آپس میں اختلافی مسائل کو دور نہ کرلیں تب تک کسی نئے موضوع یا معاہدے کے لیے مذاکرات شروع نہیں کیے جائیں گے اور پرانے موضوعات پر ہی اتفاق رائے کی کوشش جاری رکھی جائے گی۔ اس دور کو دوحہ ترقیاتی دور (Doha Development Round) کا نام دیا گیا ہے۔[2]

پانچواں وزارتی اجلاس: کین کون، 2003

2003 میں کین کون، میکسیکو کے مقام پر پانچواں وزارتی اجلاس منعقد ہوا جہاں ایک مرتبہ پھر تیسری دنیا اور پہلی دنیا کے ممالک کے درمیان اختلافات کی وجہ زراعت کا موضوع بنا۔ اس کے ساتھ ساتھ کین کون میں موجود ہزاروں عوامی تنظیموں اور مظاہرین نے اس اجلاس کی ناکامی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ کین کون وزارتی اجلاس جنوبی کوریا کے کسان لی کیون کی قربانی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ لی کیونگ ہی نے کین کون وزارتی اجلاس کے خلاف مظاہرے کے دوران خودکشی کرلی ۔اس وقت اس کے ہاتھ میں ''ڈبلیو ٹی او کسانوں کا قاتل ہے'' کا بینر تھا۔[3]

اسی طرح 2005 میں ہانگ کانگ میں منعقد ہونے والا چھٹا وزارتی اجلاس بھی ناکام ثابت ہوا کیونکہ ممبر ممالک کسی بھی اتفاق رائے تک نہ پہنچ سکے۔

کم ترقی پذیر ممالک (Least Developed Countries/LDGs)

اقوام متحدہ نے 1971 میں کم ترقی پذیر ملکوں کی درجہ بندی کی تھی۔ اقوام متحدہ کی مطابق یہ وہ ممالک ہیں جو چھوٹی اور کم پیداواری ملکی معیشت رکھتے ہیں اور جو کم فی کس آمدنی حاصل کرپاتے ہیں۔ 2000 میں ان ملکوں کی اوسط سالانہ مجموعی پیداوار فی کس 684 ڈالرز تھی یعنی ان کی آبادی کا بڑا حصہ سخت غربت کا شکار ہے۔

Source: UNCTAD XIII Data on Least Developed Countries, accessed from unctadxiii.org/en/Documents/uxiiibook_08_LDCs.pdf?

ڈبلیو ٹی او کا نواں وزارتی اجلاس: بالی 2013

دسمبر 2013 میں ڈبلیو ٹی او کا نواں وزارتی اجلاس بالی، انڈونیشیا میں منعقد ہوا۔ پے در پے ناکام وزارتی اجلاسوں کے بعد پہلی دنیا کے ممالک خصوصاً امریکہ اور یورپ کا بھرپور زور تھا کہ نویں وزارتی اجلاس کو ہر صورت کامیاب بنایا جائے تاکہ عالمی تجارت کے لیے قواعد وضوابط وضع کرنے والے ادارے ڈبلیو ٹی او کو خاتمے سے بچایا

جاسکے۔ 2008 سے جاری عالمی مالیاتی بحران کی روشنی میں ڈبلیو ٹی او کے وجود کو برقرار رکھنا عالمی سرمایہ دار قوتوں کے لیے لازمی تھا کیونکہ اس بحران کے نتیجے میں امریکہ اور یورپ کی معیشتیں دیوالیہ پن کا شکار ہوگئی تھیں۔ امریکہ نے 2008 کے مالیاتی بحران سے نمٹنے کے لیے 700 بلین ڈالرز کا بیل آؤٹ (Bail-out) پلان اپنے بینکوں کو دیا تھا تاکہ منافع پر کھڑے استحصالی نظام سرمایہ داری کو بچایا جاسکے۔[4]

یورپ میں 2008 اور پھر 2011 سے جاری مالیاتی بحران کے نتیجے میں قبرص، یونان، آئرلینڈ، اٹلی، پرتگال اور اسپین میں بڑی تعداد میں بیروزگاری بڑھی اور ان ممالک کی حکومتوں نے اپنی عوام کو دی جانے والی سرکاری سہولیات کے خاتمے کے ساتھ ساتھ سرکاری اداروں کی نجکاری کا بھی ارادہ ظاہر کیا ہے جس کے نتیجے میں یونان میں تقریباً 30 فیصد اور اسپین میں تقریباً 50 فیصد افراد کے بے روزگار ہونے کا خطرہ ہے۔[5]

ان حالات سے تنگ یورپی عوام میں بڑے پیمانے پر اضطراب پایا جاتا ہے۔ یورپ کی سڑکوں پر آئے دن مظاہرے و احتجاج دیکھنے میں آرہے ہیں۔ یورپ بھی اس مالی بحران سے نکلنے کے لیے اب تک سینکڑوں بلین یورو کا بیل آؤٹ پلان دینے پر مجبور ہوگیا ہے۔ مگر بحران اب بھی جاری ہے۔

شدید مالیاتی بحران کے اس دور کو چھپانے کے لیے پہلی دنیا کے ممالک نے ڈبلیو ٹی او کے بالی وزارتی اجلاس کو ہرصورت کامیاب بنانے کے لیے نام نہاد بالی پیکج متعارف کرایا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ڈبلیو ٹی او میں تین طرح کے گروپس واضح طور پر نظر آتے ہیں (i) پہلی دنیا پر مشتمل ممالک کا گروپ جس میں امریکہ، یورپ اور دیگر امیر سرمایہ دار ممالک شامل ہیں۔ (ii) تیسری دنیا کے ممالک کا گروپ جن میں برازیل، بھارت، پاکستان وغیرہ شامل ہیں، جو زیادہ تر ممالک زرعی معیشت پر انحصار کرتے ہیں اور صنعتی ترقی کے اعتبار سے امیر سرمایہ دار ممالک سے معاشی طور پر بہت کمزور ہیں۔ (iii) کمزور معیشت والے ممالک جنھیں ایل ڈی سیز (Least Developing Countries/LDCs) کہا جاتا ہے، شامل ہیں۔ بالی پیکیج انہی تینوں گروپس کی پیش کردہ تجاویز پر مبنی ہے۔ (i) جی 33 ممالک کی پیش کردہ تجاویز۔ (ii) LDCs (ایل ڈی سیز) کم ترقی پذیر ممالک کی پیش کردہ تجاویز۔ (iii) پہلی دنیا کے ممالک کی پیش کردہ تجاویز۔

1۔ جی-33 کی پیش کردہ تجاویز[6]

نویں وزارتی اجلاس کے لیے جی-33 ممالک نے اپنی تجاویز تیار کی تھیں جس کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

- کم آمدنی اور وسائل کی کمی کے شکار لوگوں کے لیے خوراک کی مدد کو مجموعی یا اوسط مدد کے ضمن میں شامل نہ کیا جائے۔
- دیہی ترقی، دیہی ذریعہ معاش اور کھیتی باڑی کے لیے مراعات کی حد کو گرین باکس کے تحت طے کیے گئے وعدوں سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔
- تحفظ خوراک، زمینی اصلاحات، خشک سالی اور سیلاب کی روک تھام کے اقدامات کو مراعات میں کمی کے وعدوں سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

جی-33 ممالک نے مندرجہ بالا تجاویز اس لیے دیں تاکہ ان کی عوام کے لیے خوراک کی دستیابی آسان ہوسکے اور خوراک کی کمی کے شکار افراد کی مدد کی جاسکے۔ ترقی یافتہ ممالک پہلے ہی اپنے کسانوں کو برآمدی امداد، تحقیق، فصلوں کی حفاظت کے لیے منصوبوں کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھرپور مدد فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 1995 میں جب ڈبلیو ٹی او کا قیام عمل میں آیا تھا اس وقت امریکہ کی زرعی مراعات 61 بلین ڈالرز تھی جو کہ پانچ سالوں میں بڑھ کر سال2010 میں 130 بلین ڈالرز ہوگئی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف پہلی دنیا کے ممالک خاص طور پر امریکہ، دیگر ملکوں سے ڈبلیو ٹی او کے مختلف معاہدوں کے تحت سرکاری مراعات میں کمی یا خاتمے کا مطالبہ کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے ملکوں میں زرعی پیداوار کرنے والوں کو انتہائی خطیر رقم مراعات کے مد میں دے رہے ہیں جو کہ سراسر سامراجیت کا کھلا مظاہرہ اور ناانصافی ہے۔ انہی ناہموار معاشی پالیسیوں کی وجہ سے آج تیسری دنیا کی دیہی آبادیاں خاص طور پر کسان مزدور، بے روزگاری اور وسائل کی کمی کا شکار ہیں اور نتیجے میں پہلی دنیا کے ملکوں کی دیوہیکل کمپنیوں کے منافع میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہورہی ہے۔

جی 33 ممالک

انٹیگوا اور باربودا، بارباڈوس، بیلیز، بینن، بولیویا، بوٹسوانا، کوٹ ڈی لویئر، چین، کانگو، کیوبا، ڈومینیکا، ڈومینیکن ریپبلک، السلواڈور، گریناڈا، گوئٹے مالا، گیانا، ہیٹی، ہونڈوراس، بھارت، انڈونیشیا، جمیکا، کینیا، کوریا، مڈغاسکر، ماریشس، منگولیا، موزمبیق، نکاراگوا، نائیجیریا، پاکستان، پانامہ، پیرو، فلپائن، سینٹ کٹس اور نیوس، سینٹ لوسیا، سینٹ کیرن اور گریناڈائنز، سینیگال، سری لنکا، سورینام، تنزانیہ، ٹرینیڈاڈ اور ٹوباگو، ترکی، یوگنڈا، وینزویلا، زیمبیا، زمبابوے۔

2۔ ایل ڈی سیز کی تجاویز[7]

افریقہ کے 33، ایشیاء کے 14 ممالک اور لاطینی امریکہ سے ہیٹی پر مشتمل کم ترقی پذیر ممالک کا گروپ ڈبلیو ٹی او میں ایل ڈی سیز گروپ کہلاتا ہے۔ اپنے ملکوں میں بے روزگاری، غربت اور آزاد تجارت کی پالیسیوں کی منفی اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایل ڈی سیز ممالک نے ڈبلیو ٹی او کے پالیسیوں اور معاہدوں میں اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ ان کے چند بنیادی مطالبات درج ذیل ہیں:

i۔ ایل ڈی سیز ممالک کی برآمدات کے لیے ڈیوٹی فری، کوٹہ فری اور عالمی منڈی تک آسان رسائی۔

ii۔ ترقی یافتہ ممالک خاص طور پر امریکہ اپنی کپاس پر دی گئی مراعات میں خاطر خواہ کمی کرے۔

iii۔ ایل ڈی سیز ممالک کے لیے خدمات پر چھوٹ۔

iv۔ ایل ڈی سیز ممالک کے لیے ٹرپس پر چھوٹ۔

ڈبلیو ٹی او میں ایل ڈی سیز گروپ

انگولا، بنگلہ دیش، بینن، برکینا فاسو، برونڈی، کمبوڈیا، چاڈ، کانگو، جبوتی، گیمبیا، گنی، گنی بساؤ، ہیٹی، لیسوتھو، مڈغاسکر، ملاوی، مالی، موریطانیہ، موزمبیق، میانمار، نیپال، نائیجر، روانڈا، ساموا، سینیگال، سیرالیون، جزائرسلیمان، تنزانیہ، ٹوگو، یوگنڈا، وانواٹو، زیمبیا۔

پہلی دنیا کے ممالک کی پیش کردہ تجاویز[8]

بالی پیکیج کا سب سے اہم نکتہ تجارتی سہولیات (Trade Facilitation/TF) کے حوالے سے پہلی دنیا کے ممالک کی طرف سے پیش کردہ تجاویز ہیں۔ گوکہ یہ بات طے شدہ تھی کہ جب تک دوحہ ترقیاتی فریم ورک پر بات چیت مکمل نہ ہو جائے جن میں تیسری دنیا کی زراعت کے لیے منصفانہ پالیسی سازی تھی، تب تک کوئی نیا موضوع مزید زیر بحث نہیں لایا جائے گا، مگر یورپی یونین اور پہلی دنیا کے دیگر ممالک نے ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی عیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیسری دنیا کے مفادات اور اپنے کیے گئے وعدوں کے برخلاف خودغرضی پرمبنی چال چلتے ہوئے تجارتی سہولیات کے معاہدے کو مذاکرات کے عمل میں شامل کروادیا۔

تجارتی سہولیات کے معاہدے کے چار بنیادی اصول درج ذیل ہیں:

- ہم آھنگی: قابل اطلاق قوانین، ضوابط اور حدایات میں ہم آہنگی۔
- آسانی: انتظامی اور کاروباری قوائد کے ضابطہ، طریقہ کار اور دستاویزات تک آسان اور سادہ بنانا۔
- یکسانیت: معلومات، ضروریات اور ٹیکنالوجی کے استعمال کے لیے یکساں طریقہ کار تاکہ معلومات کے تبادلے کو موثر بنایا جاسکے۔
- شفافیت: تمام فریقین کے لیے شفافیت پرمبنی سرحدوں پر معلومات، ضروریات اور طریقہ کار کی آسان رسائی۔

تجارتی سہولیات کے معاہدے کو متعارف کروانے کا مقصد کسی بھی ملک کی سرحد پر کسٹم کی پیچیدگیوں کو آسان بنانا ہے تاکہ برآمدی اور درآمدی مال جلد از جلد منڈی تک پہنچایا جاسکے۔ ترقی یافتہ ممالک کے خیال سے اس معاہدے کے اطلاق سے عالمی تجارت کو آسان بنانے میں بڑی حد تک مدد ملے گی۔ خاص طور پر وقت کی کمی اور کم اخراجات کے نتیجے میں منافع بھی بڑھے گا۔

جب کبھی بھی عالمی تجارت کی بات ہوتی ہے اس سے مراد برآمدات اور درآمدات دونوں ہوتی ہیں، مگر اعداد وشمار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عالمی تجارت میں برآمدات زیادہ تر پہلی دنیا کے ممالک کرتے ہیں جن میں امریکہ اور یورپ سرفہرست ہیں۔ مثال کے طور پر دنیا کی مجموعی گندم کی برآمدات کا جو کہ 122 میٹرک ٹن ہے، 104 میٹرک ٹن صرف پانچ ممالک برآمد کرتے ہیں جن میں امریکہ 29، یورپ 20، کینیڈا 19، آسٹریلیا 19 اور ایشیاء 17 میٹرک ٹن برآمد کرتے ہیں۔ اس طرح گندم کی مجموعی برآمدات کا 35 فیصد صرف امریکہ برآمد کرتا ہے جبکہ 24 فیصد یورپ برآمد کرتا

ڈبلیو ٹی او میں تنازعات طے کرنے کا طریقہ کار

ڈبلیو ٹی او میں ممبر ممالک کے درمیان تنازعات کو طے کرنے کے تین طریقہ کار وضع کیے گئے ہیں۔ i۔ مشاورت کے ذریعہ۔ ii۔ باقاعدہ رسمی قانونی چارہ جوئی کے ذریعہ۔

iii۔ اگرضروری ہوتو عمل درآمد کے ذریعہ۔

کسی بھی تنازع کے حل کی طرف کوشش مشاورت کے لیے ایک درخواست کے ذریعے شروع کی جاتی ہے۔ جس کے تحت کسی ممبر ملک کو کسی دوسرے ممبر ملک سے اس کے تجارتی اقدامات پر کوئی شکایت ہوتو وہ دوسرے ممبر ملک سے ڈبلیو ٹی او کے ذریعے مشاورت کی درخواست کرتا ہے۔ دونوں ملکوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ 60 دنوں کے لیے شکایات کو دور کرنے کے نیت سے مشاورت کریں۔

اگر مشاورت کے ذریعہ کوئی حل نہ نکل پائے تو شکایت کنندہ ملک شکایت سے متعلق باقاعدہ قانونی چارہ جوئی کے مرحلے کے آغاز کے لیے پینل کی کاروائی (Panel Proceedings) کی درخواست دے سکتا ہے۔ پینل دونوں فریقین کی باہمی رضا مندی سے تین سے پانچ ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جن کا تعلق تجارتی قانون کے شعبہ سے ہو۔ عام طور پر گواہی کے دو ادوار ہوتے ہیں جن میں تیسرے فریق یعنی اس ممبر ملک کی گواہی بھی شامل ہے جو کہ اس خاص شکایت کے حوالے سے ڈبلیو ٹی او کو یہ ثابت کر سکے کہ اس کا اس کیس سے گہرا تعلق ہے۔ اس کے بعد پینل ایک عبوری رپورٹ جاری کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ فریقین کو موقع فراہم کرتا ہے کہ رپورٹ کے بارے میں اپنی رائے دیں اور وضاحت طلب کریں۔ اس مرحلے پر بھی دونوں فریقین بات چیت کے ذریعہ کوئی حل نکال سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوسکے تو پینل اپنی حتمی رپورٹ جاری کردیتا ہے جو کہ ڈبلیو ٹی او کا فیصلہ ہوتا ہے۔ دونوں فریقین کسی بھی وجہ کر پینل کی رپورٹ کو رد کرسکتے ہیں یا دونوں میں سے کوئی بھی ایک فریق اس رپورٹ کے خلاف اپیلٹ باڈی میں اپیل کرسکتا ہے۔ اپیلٹ باڈی وکیلوں پر مشتمل ایک ایسی باڈی ہے جو کہ فیصلے کے تمام پہلوؤں کا زیادہ مستقل مزاجی سے جائزہ لیتی ہے۔ اس باڈی کا کام فریقین کی گواہی سننا اور یہ جاننا ہے کہ پینل نے کہاں کہاں قانونی غلطیاں کی ہیں۔ اپیلٹ باڈی پینل کے فیصلے کو مکمل یا جزوی طور پر برقرار رکھنے یا اس کو تبدیل کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اگر فیصلہ اس ملک کے حق میں ہو جس کے خلاف اپیل دائر کی گئی ہوتو معاملہ یہیں ختم ہوجاتا ہے لیکن اگر فیصلہ شکایت کنندہ ملک کے حق میں ہوتو معاملہ فیصلہ کے عمل درآمد کے مرحلے میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس مرحلہ پر اگر شکایت کنندہ ملک کو عمل درآمد کے مرحلے میں کوئی شکایت ہوتو وہ تعمیل پینل (Compliance Panel) میں درخواست درج کراسکتا ہے۔

Source: Busch, Marc L. and Reinhardt, Eric. "Trade brief on ... The WTO Dispute Settlement". SIDA, 2004, accessed from http://www9.georgetown.edu/faculty/mlb66/SIDA.pdf

ہے۔ مجموعی طور پر یورپ اور امریکہ 59 فیصد گندم برآمد کرتے ہیں[1] جبکہ دوسری طرف تیسری دنیا کے ممالک درآمد زیادہ کرتے ہیں یعنی پہلی دنیا کے ممالک سے اپنے ملکوں میں مصنوعات منگواتے ہیں۔ عالمی تجارت میں یہ عدم توازن ہمیشہ نظروں سے اوجھل رکھا جاتا ہے۔

ضرورت تو یہ تھی کہ اس عدم توازن کو دور کیا جاتا اور تیسری دنیا کے ممالک کے لیے عالمی تجارت میں حصہ لینا آسان بنایا جاتا مگر پہلی دنیا کے ممالک کی طرف سے مجوزہ تجارتی خدمات کے معاہدے کو متعارف کروانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عالمی تجارت کو منصفانہ بنیادوں پر استوار کرنے کے حق میں ہی نہیں۔ ڈبلیو ٹی او کا پلیٹ فارم شطرنج کی بساط بن کر رہ گیا ہے جہاں پہلی دنیا کے ممالک کی زیادہ تر توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ کیسے ایسی چال چلی جائے کہ ان کے مفادات کا تحفظ اور بڑھاوا یقینی ہو۔ اس کی تازہ مثال گروپ 33 اور گروپ ایل ڈی سی کی طرف سے پیش کی گئی تجاویز کے جواب میں امریکہ اور دیگر پہلی دنیا کے ممالک کا پیس کلاز (Peace Clause) یعنی ''امن کی شق'' متعارف کروانا ہے۔

پیس کلاز

تیسری دنیا کے ممالک کی تجاویز (جن میں سے زیادہ تر پہلے ہی دوحہ راؤنڈ کا حصہ تھے) کے جواب میں پہلی دنیا کے ممالک کی طرف سے پیس کلاز کا شوشہ چھوڑا گیا اور کہا گیا کہ ایک عبوری طریقہ (یعنی چند سالوں کے لیے) وضع کیا جائے جس کے تحت ممالک اپنے اپنے ملکوں میں کسانوں کو زرعی مراعات دے سکیں۔ پیس کلاز کی منظوری کی صورت میں ڈبلیو ٹی او کے ممبر ممالک ایک دوسرے کے خلاف کسانوں اور زراعت کے شعبے کو دی جانے والے مراعات پر کوئی مقدمہ درج نہیں کرسکیں گے یعنی ممالک ''امن کی حالت'' میں رہیں گے، اسی لیے اسے پیس کلاز کا نام دیا گیا ہے۔

تیسری دنیا کے ممالک کا مطالبہ تھا کہ ان کی پیش کردہ تجاویز پر تفصیلی بات کی جائے جو کہ زراعت کے مسئلے کا مستقل حل پیش کرتی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پیس کلاز کے ذریعہ تیسری دنیا کے ممالک کی تجاویز کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک جز وقتی حل پیش کیا جارہا ہے۔ اسی لیے تیسری دنیا کے ملکوں نے پہلے پیس کلاز کو مسترد کردیا تھا جن میں بھارت سرفہرست تھا۔

دوحہ راؤنڈ

نومبر 2001 میں دوحہ قطر میں عالمی تجارتی تنظیم کے چوتھے وزارتی اجلاس میں جن نکات پر اتفاق رائے سے بات چیت کی گئی اور کہا گیا کہ جب تک یہ نکات حل نہ کرلیے جائیں، تب تک کسی اور نئے موضوع پر بات نہیں کی جائے گی، اسے دوحہ ترقیاتی ایجنڈہ (ڈی ڈی اے) یا دوحہ راؤنڈ کا نام بھی دیا گیا۔ دوحہ راؤنڈ عالمگیریت کو زیادہ جامع بنانے اور دنیا کے غریبوں خصوصاً زراعت میں درپیش رکاوٹوں کے حل کے لیے طے کیا گیا۔ دوحہ راؤنڈ تیسری دنیا کے ممالک خصوصاً جی 33 ممالک کے سخت مزاحمت کے نتیجے میں تشکیل پایا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ پہلی دنیا کے ممالک خصوصاً یورپ اور امریکہ اپنے زرعی شعبے کو پہلے ہی بیش بہا مراعات دے رہے ہیں جن کے تحت امریکہ نے اپنے کسانوں کو زرعی پیداوار کے نقصان کے مد میں رواں مالی سال 14 بلین ڈالرز ادا کیے[9] جو کہ تقریباً 15 کھرب پاکستانی روپے کے برابر ہے۔ اسی طرح یورپی یونین نے سال 2012 میں اپنے زراعت کے شعبے کو مجموعی طور پر 83 بلین یورو کی مدد فراہم کی جو کہ پاکستانی 10.49 ٹریلین روپے کے برابر ہے۔ یاد رہے کہ سال 14-2013 کا مجموعی پاکستانی بجٹ تقریباً 40 کھرب روپے کا ہے۔ جو کہ امریکی ڈالر میں تقریباً 38 ملین ہیں۔[10]

المیہ یہ ہے کہ پہلی دنیا خصوصاً یورپ اپنے زرعی شعبے کو کھربوں روپے کی مراعات فراہم کررہا ہے لیکن دوسری طرف تیسری دنیا کے کسانوں کے لیے سرکاری مراعات پر تجارت میں رکاوٹ کا ڈھنڈورا پیٹ کر پابندی عائد کی گئی ہے۔ ان اعداد و شمار سے ڈبلیو ٹی او کا مکروہ چہرہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔

ان حالات میں گروپ 33 کی جانب سے پیس کلاز پر سخت ردعمل کو عوامی تحریکوں کی طرف سے اچھی نظروں سے دیکھا جارہا تھا۔ خصوصاً بھارت کا امریکہ کے سامنے ڈٹ جانا ایک خوش آئند عمل تھا کیونکہ بظاہر بھارت دنیا کے کسانوں کے حق کے لیے لڑنے والوں میں پہلی صف میں نظر آرہا تھا۔ پیس کلاز کے حوالے سے نہ صرف تیسری دنیا کی حکومتوں نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا بلکہ دنیا بھر کی سیاسی اور عوامی تنظیموں کی طرف سے بھی سخت ردعمل سامنے آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ سرمایہ دار ممالک کی چال ہے تا کہ زراعت کے حقیقی مسائل کو نظرانداز کرتے ہوئے سرمایہ دار ممالک اپنی زراعت کو بھاری مراعات دینے کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔

نویں وزارتی اجلاس کے حوالے سے یہ بات بتانا ضروری ہے کہ ڈبلیو ٹی او کے پروگرام کے تحت یہ اجلاس 6-3 دسمبر تک ہونا تھا۔ مگر آخری دن یعنی 6 دسمبر تک ممبر ممالک کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے اس لیے اجلاس کو مزید ایک دن کے لیے بڑھا دیا گیا تا کہ نویں وزارتی اجلاس کو کامیاب اجلاس کے طور دکھایا جاسکے۔ 6 دسمبر کی رات گئے تک پہلی دنیا کے ممالک خصوصاً امریکہ مختلف حربوں سے یہ کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح گروپ 33 خصوصاً بھارت کو راضی کیا جاسکے کیونکہ پہلی دنیا خصوصاً امریکہ کی راہ میں واحد مضبوط رکاوٹ بھارت تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق[11] کہ 6 دسمبر کی رات انڈونیشیا کے صدر نے بھارت کے وزیر اعظم کو فون کرکے تعاون کی درخواست کی۔ دوسری طرف گروپ 33 کے ایک اور ملک پاکستان نے پیس کلاز کے حوالے سے امریکی تجاویز کی حمایت مسلسل جاری رکھی۔ پیس کلاز کے تحت ملکوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی خوراک کی ذخیرہ اندوزی اور خوراک کے حوالے سے مراعات آئندہ چند سالوں تک دے سکیں گے۔ جبکہ گروپ 33 کے دیگر ممالک اس بات پر زور دے رہے تھے کہ زراعت کے مسئلے کے مستقل حل تک اس کا اطلاق ہو اور اس کا دورانیہ متعین نہ کیا جائے۔ بعض ذرائع کے مطابق پاکستان بھارت کے موقف

کی مخالفت اس لیے کررہا تھا کہ وہ اپنی منڈی بھارتی زرعی مصنوعات سے بچا سکے۔ اسے یہ خطرہ لاحق تھا کہ بھارت اپنے خوراک کے ذخیرے کو پاکستان برآمد کرے گا جس سے پاکستانی کسانوں اور منڈی کو نقصان ہوسکتا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ایک طرف امریکہ پاکستانی عوام پر ڈرون حملوں کے ذریعہ معصوم اور بے گناہ لوگوں کا خون بہا رہا ہے اور حکومت پاکستان اس کی مخالفت میں قرار دادیں پیش کررہی ہے مگر دوسری طرف ڈبلیو ٹی او کے پلیٹ فارم پر پاکستان امریکہ کے ساتھ مل کر ایسی تجاویز کی حمایت کرتا نظر آ رہا ہے جس سے نہ صرف پاکستان بلکہ تیسری دنیا کے کسانوں اور دیہی آبادی کے مستقبل کی تباہی یقینی ہے۔

نویں وزارتی اجلاس کے موقع پر ڈبلیو ٹی او پر تنقید کرنے والے مصالحت پسند اور مزاحمتی گروہوں نے بھی بالی شہر میں متوازی سرگرمیوں کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ مصالحت پسند گروہ ''ہماری دنیا بکنے کے لیے نہیں'' (Our World is Not for Sale) کے بینر تلے یکجا تھے۔ اس گروہ کا نظریہ یہ تھا کہ ڈبلیو ٹی او میں بڑے پیمانے پر اصلاحات کی ضرورت ہے جن کے بغیر یہ ادارہ عوام دشمن ہے، اس لیے ہمیں اس ادارے سے روابط رکھنے کی ضرورت ہے اور حکومتوں کو قائل کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ عالمی تجارتی پالیسی سازی کرتے ہوئے اپنے عوام کی ضرورتوں کا خیال رکھیں۔ اس طریقے کار کو انسائیڈ اسٹریٹجی بھی کہتے ہیں۔

مزاحمتی گروہ انڈونیشین پیپلز الائنس (Indonesian Peoples Alliance/IPA) کے بینر تلے جمع تھے۔ یہ گروہ ڈبلیو ٹی او کے وجود کے ہی خلاف ہے۔ ان کا بنیادی نعرہ ''ڈبلیو ٹی او کو کچرے میں ڈالو'' (Junk WTO) تھا۔ IPA (آئی پی اے) نے عالمی عوامی کیمپ (Global Peoples Camp) کا اہتمام کیا تھا جس میں دنیا بھر سے مزاحمتی تنظیموں، کسانوں اور مزدوروں نے شرکت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈبلیو ٹی او اپنی وجود سے لے کر آج تک ایک جانبدار ادارہ ہے اور سرمایہ داروں کے حواریوں کے قبضے میں نظر آتا ہے، اس لیے اس ادارے کو یکسر ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلی دنیا کے سرمایہ دار ملکوں نے مختلف ناکام وزارتی اجلاسوں کے بعد بالی وزارتی اجلاس میں ایک کامیاب چال چلی۔ اضافی ایک دن کا استعمال کرتے ہوئے ڈبلیو ٹی او میں بااثر ممالک خصوصاً امریکہ نے اپنی مرضی کا معاہدہ طے کروا لیا اور گروپ 33 کے تجاویز کو یکسر نظر انداز کردیا۔ نویں وزارتی اجلاس کی کامیابی عوامی اور مزاحمتی گروہوں کے لیے ایک بڑی شکست ہے کیونکہ اس کامیابی سے آزاد تجارت کی راہ میں حائل رکاوٹیں کمزور پڑگئیں ہیں جس کا فائدہ پہلی دنیا کے ممالک کو ہی ہوگا اور نتیجے میں تیسری دنیا کی پسی ہوئی دیہی آبادیوں کے لیے ناانصافیاں اور معاشی محرومیاں مزید بڑھیں گی۔ اس کامیابی کے نتیجے میں تیسری دنیا کے ممالک مزید درآمدی اشیاء کے بوجھ تلے دب جائیں گے اور پہلی دنیا کے ممالک کی برآمدات مزید بڑھ جائیں گی جس کے نتیجے میں تیسری دنیا کے ملکوں کی کمزور معیشت کو مزید نقصان ہوگا اور پہلی دنیا کے انتہائی مضبوط ممالک کے سرمایہ داروں کی اجارہ داری مزید مستحکم ہوجائے گی۔

اقوام متحدہ کے تازہ جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق اس وقت دنیا میں 842 ملین افراد یعنی ہر آٹھواں شخص شدید بھوک کا شکار ہے۔12 دنیا کی تقریباً آدھی آبادی کی یومیہ آمدنی ڈھائی ڈالر سے کم ہے۔ یونیسیف کے مطابق روزانہ 22,000 بچے صرف غربت کی وجہ سے وفات پا جاتے ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کے 27 سے 28 فیصد بچے وزن کی کمی کا شکار ہیں جن میں سے بیشتر کا تعلق جنوبی ایشیاء اور افریقہ سے ہے۔

تیسری دنیا کے ملکوں کے اسکول جانے والی عمر کے 72 ملین بچے تعلیم سے محروم ہیں جن میں 57 فیصد لڑکیاں شامل ہیں۔ آج بھی ہر سال تقریباً 400 ملین افراد ملیریا کا شکار ہورہے ہیں۔13

اوپر بیان کی گئی استحصالی داستان کو سمجھنے کے لیے ورلڈ بینک کے اپنے پیش کردہ وسائل کے استعمال کے حوالے سے اعداد و شمار کافی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی صرف 20 فیصد امیر ترین آبادی تقریباً 77 فیصد وسائل کا استعمال کرتی ہے جبکہ دنیا کی 20 فیصد غریب ترین آبادی صرف 1.5 فیصد وسائل استعمال کرتی ہے۔

اسی طرح خوراک کی قیمتوں میں پانچ چھ سالوں میں بے انتہا اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ورلڈ بینک کے مطابق 2008 میں خوراک کی قیمتیں سب سے زیادہ بڑھیں اور 2010 کے مقابلے میں 2011 میں خوراک کی قیمتوں میں 36 فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا جس میں مکئی کی قیمت میں 74 فیصد اور گندم کی قیمت میں 69 فیصد اضافہ ہوا۔14

اوپر دیے گئے اعداد و شمار کی روشنی میں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ عالمی تجارتی تنظیم کی منفی کارکردگی کی وجہ سے دنیا میں امیر اور غریب کے درمیان فاصلہ شدید تر ہوگیا ہے اور عالمگیریت کے ظلم و جبر سے دنیا کی زیادہ تر آبادی بدحال ہوگئی ہے۔ دنیا کی کثیر آبادی صحت اور تعلیم جیسے بنیادی حق سے محروم ہے جس کے نتیجے میں اس کا زندہ رہنا تک دشوار ہوتا جارہا ہے۔ ان عالمی معاشی پالیسیوں خصوصاً ڈبلیو ٹی او کے خلاف ایک شدید عالمی عوامی ردعمل اور مزاحمت کا مظاہر کیا جاتا اور ڈبلیو ٹی او کے نئے وزارتی اجلاس کو ایک بار پھر بھرپور انداز میں ناکام بنایا جاتا مگر عالمی عوامی تحریکوں کی کمزوریوں کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا۔

عوامی تحریکوں کی بالی میں ناکامی کا از سر نو تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ان وجوہات کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے جن کی وجہ سے عالمی سرمایہ دار ٹولہ یہ کامیابی حاصل کر پایا۔ مزاحمتی اور عوامی تحریکوں کو اصلاح پسندوں کے ٹولے نے اس حد تک یرغمال بنا رکھا ہے کہ حقیقی مزاحمتی تحریکیں مدھم پڑگئیں ہیں۔ دوسری طرف دنیا بھر کی این جی اوز کو بے انتہا پیسہ دیا جاتا رہا ہے جس سے انہیں بیرونی امداد کے سہارے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی راہ دکھائی جارہی ہے۔ مختلف پروجیکٹ اور اسکیموں کے نام پر بے انتہا رقم ان تنظیموں کو دی جارہی ہے تاکہ ان کے کام کا دائرہ کار مقامی سطح اور جزوی خدمات تک محدود کردیا جائے۔ امریکی اور برطانوی امدادی ادارہ،

یو ایس ایڈ (USAID)، ڈفیڈ (DFID) اور آسٹریلوی امدادی ادارہ آس ایڈ (AusAid) دیگر عالمی اداروں مثلاً اقوام متحدہ کے خوراک اور زراعت کے ادارے (Food and Agriculture Organization/FAO) کے ذریعہ دنیا بھر کے خاص طور پر تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملکوں میں ایک خاص معاشی و سیاسی نقطہ نظر کے تحت سوچ سمجھ کر آبادیوں اور اداروں کو اصلاحاتی طرز عمل کی طرف دھکیل رہے ہیں تاکہ آبادیاں اور ادارے مزاحمتی طریقہ کار کو یکسر نظر انداز کردیں۔

اب وقت آن پہنچا ہے کہ عالمی سامراجیت کی سازشوں کو سمجھتے ہوئے مزاحمتی گروہ یکجا ہوکر اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے، جن سے نہ صرف ان کی بلکہ اس کائنات کی بقاء وابستہ ہے، ایک ہمہ گیر اور منظّم منصوبہ بندی کریں تاکہ عالمی سامراجیت کے ہتھ کنڈے مثلاً ڈبلیو ٹی او جیسے اداروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزادی حاصل کی جاسکے۔

حوالہ جات

1. Chakravrthi Ragharam. "Seattle WTO Ministerial ends in failure." Third World Resurgence No 112/113, December 99/January 2000. Third World Network, accessed from http://www.twnside.org.sg/title/deb2-cn.htm

2. Fergusson, Ian F. "World Trade Organization Negotiations: The Doha Development Agenda." Congressional Research Service, December 12, 2011. Accessed from fas.org/sgp/crs/misc/RL32060.pdf

3. Food First: Institute for Food and Development Policy. "Activists see Powerful message in WTO Protester's Suicide." September 17, 2003. Accessed from http://www.foodfirst.org/fr/node/1205

4. Clark, Andrew. "US senate backs $700 billion bail-out plan." The Guardian, October 2, 2008, accessed from www.theguardian.com/business/2008/oct/02/creditcrunch.marketturmoil

5. CNN Library. "European debt crisis fast facts." December 19, 2013, accessed from edition.cnn.com/2013/07/27/world/europ/european-debt-crisis-fast-facts/

6. IBON International. "IBON primer on the WTO 'Bali Package'." Philippines, IBON International, 2013.

7. Ibid.

8. Ibid.

9. Lynch, David J. and Bjerga, Aban. "Taxpayers turns US farmers into fat cats with subsidies." Bloomberg Personal Finance, September 9, 2013, accessed from www.bloomberg.com/news/2013-09-09/farmers-boost-revenue-sowing-subsidues-for-crop-insurance.html

10. EuroActiv.com. "EU farm subsidies rise despite downward trend: OECD." EuroActive.com PLC, 2013, September 19, 2013, accessed from www.euractive.com/cap/eu-farm-subsidies-rise-despite-d-news-530555

11۔ بالی انڈونیشیاء میں ڈبلیو ٹی او کے نویں وزارتی اجلاس 6 دسمبر، 2013 کو عوامی گروہ کی ایک ان سائیڈ اسٹریٹجی میٹنگ کے دوران راقم کو یہ بات سننے کو ملی۔

12. FAO, IFAD and WFP. "The state of Food insecurity in the World 2013: the multiple dimensions of food security." Rome, FAO, 2013. Accessed from http://www.fao.org/docrep/018/i3434e/i3434e.pdf

13. United Nations. "The Millennium Development Goals Report, 2007." United Nations, New York, 2013, p. 10. Accessed from http://www.un.org/millenniumgoals/pdf/mdg2007.pdf

14. The World Bank Group, Poverty Reduction & Equity Group, Poverty Reduction and Economic Management (PREM). "Food price watch." The World Bank Group, 2011, p. 2, accessed from ttp://siteresources.worldbank.org/INTPOVERTY/Resources/335642-1210859591030/FPW_April2011.pdf

بقیہ حوالہ جات: پاکستان میں آسٹریلوی ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقی کا ایک جائزہ

32- Australian High Commission, Pakistan. (2013). Attachment 2. "Sunflower Diplomacy: Australia lends a helping hand to Sindhi farmers," (Press release). April 30, 2012, accessed from http://www.pakistan.embassy.gov.au/islm/PR300412AdiSKHI.html

33- Australian High Commission, Pakistan. (2013). "Australia-Pakistan Joint Trade Committee meets in Islamabad to boost trade," (Press release). June 19, 2013, accessed from http://www.pakistan.embassy.gov.au/files/islm/130619-PR-AusPakJTCMeeting.pdf

34- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "Pakistan," November 1, 2013, accessed from http://aid.dfat.gov.au/countries/southasia/pakistan/Pages/home.aspx

35- Roots for Equity, (2005). "Sunflower: The smiling face of lucre. A study on the impact of sunflower seeds on women farm labor" in Taguiwalo, Judy M. (Ed). "Intensifying working women's burdens: The impact of Globalization on women labor in Asia." Philippines, Asia Pacific Research Network.

36- Ibid.

37- Australian Government. "Australia in the Asian century: Pakistan profile," p. 2, accessed from http://www.dfat.gov.au/publications/asian-century/downloads/pakistan.pdf

38- Business Recorder. "Pakistani mangoes get clearance in Australia: exporters," September 9, 2013, accessed from http://www.brecorder.com/pakistan/business-a-economy/135086-pakistani-mangoes-get-clearance-in-australia-exporters.html

39- University of Agriculture, Faisalabad, Pakistan. "Australian delegation meets UAF Prof Dr Iqrar Ahmad Khan at VC syndicate," 2011, accessed from http://www.uaf.edu.pk/golden_jubilee/events/111215.html

40- Australian High Commission, Pakistan. (2013). "Australia-Pakistan Joint Trade Committee meets in Islamabad to boost trade," (Press release). June 19, 2013, accessed from http://www.pakistan.embassy.gov.au/files/islm/130619-PR-AusPakJTCMeeting.pdf

41- Australian Government. "Australia in the Asian century: Pakistan profile," p. 2, accessed from http://www.dfat.gov.au/publications/asian-century/downloads/pakistan.pdf

42- Australian High Commission, Pakistan. (2013). "Australia-Pakistan Joint Trade Committee meets in Islamabad to boost trade," (Press release). June 19, 2013, accessed from http://www.pakistan.embassy.gov.au/files/islm/130619-PR-AusPakJTCMeeting.pdf

43- Australian High Commission, Pakistan. (2013). "Australian trade and investment strategy towards Pakistan," (Press release). May 4, 2012, accessed from http://www.pakistan.embassy.gov.au/islm/PR040512AutdPakStgy.html

44- Ibid.

45- U.S. Energy Information Administration. "Technically recoverable shale oil and shale gas resources: an assessment of 137 shale formations in 41 countries outside the United States," June 10, 2013, accessed from http://www.eia.gov/analysis/studies/worldshalegas/

46- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "AusAid-Department of Foreign Affairs and Trade integration," October 31, 2013, accessed from http://aid.dfat.gov.au/LatestNews/Pages/dept-integration.aspx

47- AID/WATCH. "AID/WATCH in the news: Reintegration of AusAID shows global poverty not a priority," September 20, 2013, accessed from http://aidwatch.org.au/news/aidwatch-in-the-news-reintegration-of-ausaid-shows-global-poverty-not-a-priority

پاکستان میں نجکاری اور آزاد تجارت کے عام زندگی پر اثرات

تحریر: آصف خان

معاشرہ اور پیداواری تاریخ، ایک جھلک

انسان کی تاریخ لاکھوں سالوں پر محیط ہے۔ آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس سے پہلے انسان مختلف ادوار گزار چکا ہے۔ سب سے پہلے اشتراکیت کا دور تھا جس کو ابتدائی کمیونزم کہتے ہیں۔ اس دور میں قدرت انسان پر حاوی تھی اس لیے انسان کو زندہ رہنے کے لیے مل جل کے رہنا ضروری تھا۔ دوسرا دور غلامی کا تھا، اس دور میں جو طاقتور تھا اس نے زرخیز زمین، پانی، جنگل اور قدرتی وسائل پر قبضہ کر لیا اور وہ بندہ آقا کہلاتا تھا۔ آقا کو زمینوں پر کام کرنے کے لیے انسان کی ضرورت تھی تو کمزوروں کو غلام بنایا گیا۔ غلام آقا کی زمین پر مفت میں کام کرتے تھے۔ اس طرح زمین اور انسان آقا کی نجی ملکیت تھے۔ غلام کو کام کرنے کی نہ ہی کوئی اجرت ملتی تھی نہ ہی اس کو بیوی بچوں کے ساتھ ایک خاندان کی حیثیت سے رہنے کا حق تھا۔

تیسرا دور جاگیرداری کا دور تھا اس دور میں زمین کی ملکیت جاگیردار کی تھی اور انسان بطور مزارع یا ہاری کام کرتا تھا۔ یہ دور غلامی کے دور سے کچھ بہتر تھا اس میں ہاری کو کام کے بدلے کچھ اناج یا اشیاء دی جاتیں تھیں تاکہ وہ زندہ رہ پائے۔ ہاری اپنا خاندان بھی رکھ سکتا تھا اور سارا خاندان جاگیردار کی زمین پر کام کرتا تھا۔

چوتھا دور سرمایہ داری کا ہے۔ اس دور میں سرمایہ دار اور مزدور کا رشتہ ہے، سرمایہ داری نظام میں جو اثاثے ہیں مثلاً کارخانے، دوکانیں، اسکول، اسپتال وغیرہ وہ سرمایہ دار کی نجی ملکیت ہیں۔ اس دور میں مزدور نے اپنے کئی حق منوا لیے مثلاً مزور کو کام کرنے کی اجرت ملتی ہے یعنی کام کے بدلے پیسہ ملتا ہے اور مزور کا اپنا خاندان بھی ہوتا ہے۔

ان انسانی ادوار میں جانے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ جو طاقتور تھا اس نے ہر دور میں قدرتی وسائل، پانی، زمین، جنگل، انسان کو اپنے قبضے میں کیا اور ان وسائل کو اپنی نجی ملکیت بناتے ہوئے ان کے استعمال سے بے تحاشہ منافع کمایا جس کی وجہ سے یہ طاقتور طبقہ جس کی تعداد معمولی سی ہے ایک بہت بڑی طاقت کی صورت میں ابھر کر ہمارے سامنے آیا۔

اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ہر دور کے خاتمہ پر نئے آنے والا دور پچھلے دور سے انسانیت کے لیے کچھ بہتری لیے ہوا ہے۔ یقیناً سماج میں بہتری ہمیشہ عوام کی شدید جدوجہد کی وجہ سے ہی ممکن ہو پاتی ہے جیسا کہ بتایا گیا کہ غلام اجرت اور خاندان رکھنے کے حق سے محروم تھا لیکن جاگیرداری سے گزرتے ہوئے اب سرمایہ داری نظام میں مزدور کچھ حاصل کر پایا ہے۔ ہر پیداواری نظام اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ ظلم کے ذریعہ استحصال کی شرح بڑھاتا جائے لیکن ہر دور میں مزدور نے کئی تکلیفیں اور اذیتیں جھیل کر اپنے لیے اور آنے والی نسلوں کے لیے بہتر حالات پیدا کیے ہیں۔

سرمایہ داری نظام

آج کے سرمایہ دارانہ دور کو سرمایہ داری کے علمبردار، مفکر، فلسفی اور انسانی حقوق کی تنظیمیں اور کارکن انقلابی دور کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس دور میں انسان نے بہت ترقی کی ہے، انسان چاند پر گیا ہے، سائنس نے انسان کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے مثلاً ہوائی جہاز اور گاڑیاں بنانے سے انسان جو سفر دنوں میں کرتا تھا اب گھنٹوں میں کرتا ہے۔ طرح طرح کی مشینری بنائی گئی جس میں کمپیوٹر، ٹی وی، ریفریجریٹر، ٹیلی فون، ایئر کنڈیشن شامل ہیں۔ ان اشیاء نے انسان کی زندگی میں بہت سہولت پیدا کی مگر ایک سیاسی کارکن ہونے کے ناطے سے میرا یہ سوال ہے ان سرمایہ داروں، مفکروں اور انسانی حقوق کے علمبرداروں سے کہ یہ سائنسی ایجادات کس نے کیں؟ اس سے فائدہ کس کو ہوا؟ یہ ایجادات ایک خاص طبقے کی مدد کے لیے کی گئیں جن کے پاس بہت سا سرمایہ تھا، یعنی سرمایہ دار نے اپنا سرمایہ مزید بڑھانے اور منافع کمانے کے لیے سائنس کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ ان سائنسی ایجادات سے عام انسان کو کیا فائدہ ہوا؟ اگر ہم پاکستان کی بات کریں تو پاکستان کی آبادی کے کم از کم 75 فیصد لوگ کسان اور مزدور ہیں اور ان میں سے اک بڑی تعداد کے پاس مشکل سے کھانے کو دو وقت روٹی ہے۔ تو یہ اتنی بڑی آبادی جس کے پاس زندگی گزارنے کی بنیادی ضروریات تک پہنچ بہت ہی مشکل سے ہوتی ہے یا کئی کی ہوتی ہی نہیں تو یہ سائنسی ایجادات ان لوگوں کے کس کام کی۔ جو دو وقت کی روٹی نہیں کھا سکتے ان کی زندگی میں سرمایہ داری کی سائنس کیا تبدیلی لائے گی؟

یہ سرمایہ داری نظام ظلم پر بنی نظام ہے، اس نظام کا مقصد عام انسان کی فلاح نہیں ہے، اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ منافع کمانا ہے اور سرمایہ دار کو منافع اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب عام انسان، کسان اور مزدور کا استحصال ہو۔ یہ استحصال پر مبنی نظام ہے اس لیے ہم اس نظام سے باغی ہیں۔ اس نظام میں عام انسان، کسان مزدور کی فلاح ممکن ہی نہیں۔ اس نظام کو مزید مضبوط کرنے اور دنیا کے تمام وسائل کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے سرمایہ دار حکومتیں اور ان کی کمپنیاں مل کر ایسے قوانین بنا رہیں ہیں تاکہ زمین، اس پر موجود اندر اور باہر جتنے بھی وسائل ہیں وہ پوری طرح ان سرمایہ داروں کے قبضے میں آجائیں، چاہے اس کی قیمت قدرت اور غریب آبادیوں کو کتنی ہی چکانی پڑے اس کی ان سامراجی طاقتوں کو کوئی پرواہ نہیں۔ ان کا مقصد صرف

اور صرف منافع کمانا ہے دنیا کا یہ پیداواری نظام تمام کسانوں اور محنت کشوں کے خون پسینے سے چل رہا ہے۔

سرمایہ دار، کسان مزدوروں کو فوج اور قانون کے ذریعہ باندھ کر ان کے استحصال کو یقینی بناتا ہے جس کے بغیر سرمایہ داروں کا سامراجی طبقہ نہ ہی دنیا کے وسائل پر قبضہ کرسکتا ہے اور نہ ہی منافع کماسکتا ہے۔ کسان مزدوروں کے خون کا آخری قطرہ نچوڑنے والے نظام کو مضبوط کرنے کے لیے سرمایہ دار ملکوں اور ان کی کمپنیوں نے ایسے قوانین اور پالیسیاں بنائی ہیں جن کی مدد سے وہ پوری دنیا کے وسائل کو اپنے قبضے میں کرسکیں۔ ان قوانین اور پالیسیوں میں ادارے مثلاً ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، ڈبلیو ٹی او شامل ہیں جو کئی پالیسیاں عوام پر مسلط کرتے ہیں جیسے سبز انقلاب، سیپ پالیسی شامل ہیں۔ سرمایہ داروں نے سیپ پالیسی کے تحت نجکاری اور آزاد تجارت کے قوانین ہماری ہی حکومتوں کی مرضی اور مدد سے چھوٹے اور بے زمین کسان اور مزدوروں کی محنت پر قبضہ کرنے کے لیے لگائے ہیں۔ نجکاری اور آزاد تجارت کے قانون سے پاکستان پر کیا اثرات پڑے اس پر غور کرتے ہیں۔

پیداواری شعبہ جات اور نجکاری

پچھلے تیں، چالیس سالوں کے دوران سرمایہ داروں نے سرمایہ داری نظام کی مضبوطی اور اس کو مزید بڑھانے کے لیے پالیسی سازی میں بہت تیزی لائی ہے جس میں ایک عوام دشمن اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام ہے۔ اس پروگرام کے تحت نجکاری کی پالیسی کو ہم پر زبردستی لاگو کیا گیا جس کی وجہ سے بیروزگاری اور مہنگائی نے چھوٹے اور بے زمین کسان مزدور کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ نجکاری پالیسی کی وجہ سے خوراک، پانی، تعلیم، صحت، روزگار اور ٹرانسپورٹ جیسی اہم ضروریات کو حکومت کے اختیار سے نکال کر نجی مالکان کے حوالے کردیا تا کہ سرمایہ دار ان ضروریات زندگی کو منڈی میں بیچ کر زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرسکیں۔ نجی کاروباری شعبہ جو اب زیادہ تر بین الاقوامی کمپنیوں پر مشتمل ہے اور اس سازش میں ہماری حکومتیں بھی شامل ہیں، منڈی میں ضروریات زندگی اور خدمات فروخت کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر پی ٹی سی ایل کی نجکاری کر دی گئی ہے۔ اس کو دبئی کی کمپنی اتصالات (Etisalat) نے خرید لیا ہے۔ اسی طرح ریلوے کے شعبے میں کئی نئی نجی ٹرینوں کا اضافہ کر دیا گیا مثلاً قراقرم اور بزنس ایکسپریس۔ سرکاری بسیں ختم کر دی گئیں، اب ملکی اور غیر ملکی نجی شعبہ یہ خدمات پیش کر رہا ہے جس کی مثال، ڈائیوو، اور فیصل موورز ہیں۔

نجکاری پالیسی کے اثرات کا اگر علاقائی جائزہ لیں تو میں حطار، ہری پور کی بات کروں گا۔ ہری پور صوبہ خیبر پختونخوا کا ایک ضلع ہے۔ حطار خیبر پختونخوا کا سب سے بڑا انڈسٹریل زون ہے۔ حطار انڈسٹریل اسٹیٹ میں اس وقت 500 سے زائد کارخانے واقع ہیں۔ نجکاری سے پہلے ہری پور میں سات کارخانے گورنمنٹ کی ملکیت میں تھے۔ ان میں ایک گھی کا کارخانہ، اس کا نام یکتا گھی ملز تھا۔ دوسرا کپڑے کا کارخانہ، اس کا نام تربیلا کاٹن ملز تھا۔ تیسرا، پاک چائنا۔ چوتھا کھاد کا کارخانہ، اس کا نام ہزارہ فاسفیٹ تھا۔ پانچواں سیمنٹ کا کارخانہ، اس کا نام مستحکم سیمنٹ تھا۔ چھٹا ٹیلی فون بنانے کا کارخانہ تھا اس کا نام ٹیلی فون انڈسٹری آف پاکستان (ٹی آئی پی)۔ ساتواں کارخانہ ہیوی الیکٹریکل کمپلیکس ہے۔ ان سات کارخانوں میں پانچ نجکاری کے نذر ہوگئے، اب صرف دو کارخانے گورنمنٹ کی ملکیت ہیں۔ ان میں ایک، ٹیلی فون کی فیکٹری اور دوسرا ہیوی الیکٹریکل کمپلیکس ہے۔ 7 ستمبر، 2013 کو مقامی اخبار (روزنامہ صبح) میں خبر تھی کہ ٹیلی فون انڈسٹری آف پاکستان کو شاید جلد ہی نجکاری کی نذر کر دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہیوی الیکٹریکل کمپلیکس کو پاکستان پرائیویٹائزیشن کمیشن، زرداری حکومت کے تحت نجکاری ہونے والی کمپنیوں کی لسٹ میں شامل کرچکی تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس فیکٹری کے بارے میں بھی حکومت کے عزائم خطرناک ہیں۔ اگر اس کی بھی نجکاری ہوگئی تو ہزاروں مزدوروں کو تاریکی کی دلدل میں دھکیل دیا جائے گا۔

مزدور اور سرکاری نظام

حطار میں واقع سیمنٹ بنانے کا کارخانہ مستحکم سیمنٹ پہلے حکومت کی ملکیت تھا۔ اسے 1998 میں برطانیہ کی کمپنی بیسٹ وے (Bestway) کو فروخت کردیا گیا۔ جب یہ کارخانہ حکومت کی ملکیت تھا تو اس وقت اس میں تقریباً 2,500 مزدور کام کرتے تھے۔ اس میں 95 فیصد کی نوکری پکی تھی یعنی وہ سرکاری ملازم تھے۔ اُس وقت اس کارخانے میں مزدور کو پندرہ سے بیس ہزار روپے تنخواہ کے علاوہ کئی طرح کی مراعات حاصل تھیں جن میں شامل سالانہ پچاس، ساٹھ ہزار روپے بونس تھا۔ ہر مزدور کو سال بھر کے لیے کپڑے اور جوتے ملتے تھے۔ فیکٹری میں کام کے دوران پہننے کے لیے الگ کپڑے اور جوتے ملتے تھے۔ انشورنس پالیسی، پنشن کی سہولت، فیکٹری میں مفت کھانے کے علاوہ اور بہت سی مراعات حاصل تھیں مثلاً مزدور کے پورے خاندان کا علاج ادارے کی ذمہ داری تھی۔ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا علاج کسی بھی اچھے اسپتال میں مفت کروا سکتا تھا۔ مزدور کے بچوں کی تعلیم کے لیے ادارے نے مفت معیاری اسکول بھی بنائے تھے۔ اگر کوئی مزدور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا تو ادارہ اس کی مدد کرتا تھا۔ اس کے علاوہ فیکٹری کے مزدوروں کے لیے حکومت نے بہت بڑی رہائشی کالونی بنوائی تھی جن میں بجلی، پانی، سوئی گیس، بچوں کے لیے کھیل کا میدان، اسپتال، اسکول شامل تھے۔

فیکٹری میں مزدور یونین بہت مضبوط تھی۔ فیکٹری کی انتظامیہ مزدوروں کے خلاف یا ان کی مرضی کے بغیر کوئی پالیسی لاگو نہیں کرسکتی تھی۔ چنانچہ مزدور بہت خوش حال تھے جس کی وجہ سے پورے علاقے میں معاشی حوالے سے اس کے مثبت اثرات

پڑے۔ علاقے کی مارکیٹ اس فیکٹری کے مزدور کی خوشحالی کی وجہ سے آباد تھی اور یہی صورت حال علاقے کی دوسری فیکٹریوں کی تھی جو اُس وقت حکومت کے پاس تھیں۔ ان کے بھی مزدوروں کو یہی مراعات حاصل تھیں۔ نتیجتاً مزدور بستیاں آسودگی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

مزدور اور نجکاری نظام

1998 میں حکومت نے چالبازی کی اور مستحکم سیمنٹ فیکٹری کو نجکاری پالیسی کے تحت برطانیہ کی کمپنی بیسٹ وے کو فروخت کر دیا۔ یعنی فیکٹری ایک سرمایہ دار کے ہاتھ میں چلی گئی۔ مستحکم سیمنٹ کی جب نجکاری کی گئی تو اس وقت اس فیکٹری کو مکمل طور پر بند کر دیا گیا اور تمام مزدوروں کو کچھ پیسے دے کر نوکری سے نکال دیا گیا۔ بیسٹ وے گروپ کو فیکٹری بند حالت میں بیچی گئی جس کی وجہ سے فیکٹری بہت سستے داموں حاصل کی گئی۔ دوسرا فائدہ بیسٹ وے کے مالکان کو یہ ہوا کہ مزدور انھوں نے اپنی مرضی سے رکھے، ایک تو مزدور بہت کم رکھے گئے دوسرا 95 فیصد نئے مزدوروں کو بھرتی کیا گیا۔ ان میں 20 فیصد کو پکی نوکری دی گئی اور باقی کو روزانہ کی دیہاڑی پر رکھا گیا۔

سرمایہ دار کو مزدور کی فلاح اور خوشحالی سے کوئی غرض نہیں، اس نے اپنا پیسہ صرف اور صرف منافع حاصل کرنے کے لیے لگایا تھا۔ سرمایہ دار کو زیادہ منافع اس وقت ہوتا ہے جب وہ مزدور کی محنت پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ جب مزدور کا استحصال ہوگا تو سرمایہ دار کا منافع بڑھے گا۔ مزدور کی محنت سے منافع کی شرح بڑھانے کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ مزدور کی تنخواہ کم کردی جائے اور پیداوار اتنی ہی رکھی جائے۔ دوسرا طریقہ ہے کہ مزدور کے اوقات کار بڑھا دیے جائیں لیکن مزدور کی اجرت وہی رکھی جائے اور ساتھ ساتھ مزدوروں کی تعداد کم کردی جائے۔

مزدور کا استحصال اس وقت ہونا ممکن ہے جب مزدور کمزور ہوتا ہے۔ بیسٹ وے نے مزدور کو کمزور کرنے کے لیے حکومت کے ساتھ مل کر سب سے پہلے مزدور یونین کو ختم کیا جس کی وجہ سے مزدور تنہا ہوگیا۔ سب سے پہلے مزدوروں کی چھانٹی کی گئی اور ساتھ ساتھ مزدوروں کی تمام مراعات کو ختم کر دیا گیا۔ جہاں اس فیکٹری میں 2500 مزدور کام کرتے تھے اب ان کی تعداد 400 ہوگئی، ان میں بھی بہت کم کو پکی نوکری اور زیادہ مزدوروں کو روزانہ دیہاڑی کی بنیاد پر ملازمت دی گئی۔ مزدور کی تنخواہ کو کم کر دیا گیا اب پکے مزدور کو دس ہزار روپے ماہانہ اور دیہاڑی پر مزدور کو تین سو روپے دیہاڑی ملتی ہے۔ مزدور کا سالانہ بونس، تعلیم، صحت، رہائش اور بہت ساری مراعات کو ختم کر دیا گیا۔ جب مستحکم سیمنٹ فیکٹری حکومت کے پاس تھی تو حکومت نے فیکٹری کے نزدیک مزدوروں کے لیے ایک بڑی رہائشی کالونی بنائی تھی۔ نجکاری کے بعد اس کالونی کو ختم کر دیا گیا۔ تمام رہائشی گھر مسمار کر دیے گئے۔

فیکٹری کی نجکاری کی وجہ سے پورے علاقے کے معاشی حالات پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ اس کے آس پاس کے علاقے کی تمام منڈیاں ختم ہوگئی ہیں۔ یعنی جو لوگ فیکٹری کے براہ راست ملازم نہیں تھے نجکاری کی وجہ سے ان کی بھی دو وقت کی روٹی کا ذریعہ ختم ہوگیا۔ نجکاری سے پہلے مزدور آٹھ گھنٹے کام کرتا تھا اس کے عوض اس کو اچھی تنخواہ اور بہت ساری مراعات ملتی تھیں۔ اب نجکاری کی ظالمانہ پالیسی کی وجہ سے مزدور سے سولہ، سولہ گھنٹے کام لیا جاتا ہے، اس کے بدلے مزدور کو کچھ نہیں ملتا، مزدور کے معاشی حالات دن بدن خراب ہو رہے ہیں۔ یعنی اپنی محنت سے کھانے والا اب گداگر بن گیا ہے۔

نجکاری کے ماحول پر اثرات

یہ کرہ ارض اس وقت شدید ماحولیاتی بحران کا شکار ہے۔ اگر ہم پاکستان کی مثال لیں تو پچھلے 15، 20 سالوں کے دوران پے درپے ملک بڑے بڑے سیلابوں، سیلابی اور طوفانی بارشوں کے علاوہ خشک سالی، سمندری طوفانوں اور زلزلے کا شکار رہا ہے۔ ان آفات کا شدید اثر بڑے پیمانے پر براہ راست کسان آبادیوں اور مزدور بستیوں پر پڑا ہے۔ ایک طرف موسمی بحران، زرعی زمینوں کو تباہ کر دیتا ہے اور دوسری طرف لاکھوں افراد کو بے گھر کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ معاش کے دیگر سلسلے بھی بند ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں معاشرے کے لیے نہ روزمرہ کی زندگی بچتی ہے، نہ اسکول اور تعلیم کی سہولتیں اور نہ ہی امن امان۔

ماحولیاتی بحران کا سارا تعلق صنعتی پیداوار سے ہے جو کہ سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ اس نظام میں جدید مشینری، کارخانے، جدید مشینی زراعت شامل ہیں جو کہ سب ڈیزل، پٹرول، گیس اور کوئلے کے محتاج ہیں۔ یعنی سرمایہ داری نظام کا سارا دارو مدار تیل اور گیس پر ہے۔ تیل اور گیس کے زیادہ استعمال سے فضاء میں کاربن گیسز بہت زیادہ مقدار میں جمع ہوگئی ہیں جس کی وجہ سے زمین کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ سورج کی شعاعیں زمین سے ٹکرا کر جب واپس جاتی ہیں تو یہ گیسز اس کو واپس زمین کی طرف بھیج دیتی ہیں اس سے زمین گرم ہو رہی ہے۔ اس کا قدرت پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ سرمایہ دار کو قدرت اور ماحول سے کوئی سروکار نہیں اس کو تو بہت سارا منافع چاہیے، اس منافع کی خاطر وہ زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔

ہری پور کے علاقہ حطار میں اس وقت سیکڑوں فیکٹریاں ہیں اور دو کلو میٹر کے دائرے میں تین سیمنٹ کی فیکٹریاں ہیں جو روزانہ ٹنوں کے حساب سے سیمنٹ آبادیوں پر پھینک رہی ہیں۔

نجکاری سے پہلے اور نجکاری کے بعد کا ماحول پر اثرات کا اگر جائزہ لیں تو اس میں مستحکم سیمنٹ کی نجکاری سے پہلے بھی یہ فیکٹری کافی آلودگی کا باعث تھی۔ مثلاً اس فیکٹری کی چمنیاں ٹنوں کے حساب سے فضاء میں گرد و غبار پھینک رہی تھیں۔ اس وقت یہ فیکٹری زیادہ تر فرنس آئل پر چل رہی تھی اس وجہ سے بھی ماحول کافی آلودہ ہو رہا تھا۔ سیمنٹ بنانے کے لیے جو پتھر پہاڑ سے لایا جاتا ہے وہ پہاڑ بھی آبادی کے

نزدیک ہے۔ فیکٹری والے پتھر توڑنے کے لیے پہاڑ پر بارود وغیرہ سے پتھر ریزہ ریزہ (بلاسٹنگ) کرتے تھے، اس سے قریبی گاؤں کی آبادی بہت متاثر ہوئی۔ لوگوں کے مکان بلاسٹنگ کی وجہ سے ٹوٹ گئے۔ اس وقت جو مزدور فیکٹری میں کام کر رہے تھے زیادہ تر مقامی تھے۔ ان کو صحت اور تعلیم کی سہولت فیکٹری کی طرف سے مفت تھی، اس لیے فیکٹری کی آلودگی سے جو بیماری ہوتی تھی کم از کم مزدور کا علاج ہو جاتا تھا۔

فیکٹری کی مزدور یونین بہت مضبوط تھی، اس وجہ سے علاقے میں جو ماحولیاتی نقصان ہوتا تھا اور جس کا ازالہ ممکن تھا وہ فیکٹری پورا کرتی تھی۔ مثلاً جو مکان بلاسٹنگ کی وجہ سے متاثر ہوتے تھے ان کو فیکٹری مرمت کر کے دیتی تھی۔ فیکٹری کے نزدیک جو زرعی زمین تھی وہ بھی آلودگی سے متاثر ہو رہی تھی، خاص کر کے کوئلے کے استعمال کی وجہ سے بہت زیادہ نقصان تھا، اس کا بھی کسان کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ جب سے مستحکم سیمنٹ نجی ملکیت میں چلی گئی آلودگی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ پیداوار کے لیے بڑے پیمانے پر ہیوی مشینری کا استعمال کیا جانے لگا اور فیکٹری کا پلانٹ ڈبل کر دیا گیا۔ ظاہر ہے پیداوار کو بڑھانے کے لیے ایندھن کا استعمال بھی زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ سرمایہ دار نے اب سستا ایندھن استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ یعنی فرنس آئل کی جگہ کوئلے کا استعمال بڑھ گیا ہے۔ کوئلہ فرنس آئل سے کہیں زیادہ ماحول کو نقصان پہنچاتا ہے۔

نجی مالکان نے فیکٹری کی پیداوار بڑھادی ہے جس کی وجہ سے اب پہاڑ بھی پہلے سے زیادہ کٹنے شروع ہو گئے اور بلاسٹنگ بھی زیادہ ہونے لگی ہے۔ اس عمل سے قریب کی آبادیوں پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ مکان پہلے سے زیادہ خراب ہو رہے ہیں لیکن فیکٹری کے مالک، مکان کی مرمت نہیں کرواتے اور نہ ہی صحت کی سہولیات دیتے ہیں۔ مستحکم سیمنٹ فیکٹری بیسٹ وے گروپ نے خریدی، اب اس گروپ کے اس علاقے میں تین پلانٹ چل رہے ہیں۔ یہ پلانٹ سرسبز و شاداب زمینوں پر لگائے گئے ہیں جہاں گنجان آبادی واقع ہے۔

یہ آبادیاں شدید ماحولیاتی بحران کا شکار ہیں اور بہت سی بیماریاں اب ان کا مقدر بن گئی ہیں۔ ان میں کینسر، یرقان، ٹی بی، جلدی امراض، الرجی زیادہ ہیں۔ خاص کر خواتین پر اس ماحولیاتی آلودگی کے بہت برے اثرات پڑے ہیں۔ زچہ بچہ کی صورت حال بہت بگڑ گئی ہے۔ ڈلیوری کے پیچیدہ مسائل کا سامنا ہے۔ اب جو بچے پیدا ہو رہے ہیں وہ پیدائشی طور پر کمزور ہیں۔ آپس میں جڑے ہوئے بچے اس علاقے میں کافی پیدا ہو رہے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ ان سیمنٹ فیکٹریوں کا اتنا زیادہ شور ہوتا ہے کہ وہاں کی آبادیاں اس سے بہت تنگ ہیں۔ اس شور سے آبادی پر بہت منفی اثرات پڑے ہیں۔ مثلاً اب وہاں کے لوگوں میں چڑچڑاپن زیادہ پایا جانے لگا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ ہیوی مشینری کے شور کی وجہ سے ہے۔

سرمایہ دار نے زیادہ پیداوار اور منافع کی خاطر اس علاقے کے ماحول کو تباہ کر دیا ہے۔ پہاڑ فیکٹری والوں نے لیز پر حاصل کئے ہیں۔ اندازہ ہے کہ جہاں پہلے دو سو ٹرک سیمنٹ کے نکلتے تھے اب پانچ سو نکل رہے ہیں۔ بہت خوبصورت پہاڑ تھے جو اب نہیں ہیں۔ قدرتی پہاڑ تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ قیمتی لکڑی اور معدنیات ایک خاص طبقہ اپنے مفاد کی خاطر ختم کر رہا ہے۔ پہاڑوں سے درخت کاٹ لیے گئے ہیں، اس پہاڑ پر ہزاروں درختوں پر مشتمل بڑے بڑے جنگل تھے، جنگلی جانور تھے۔ اب تمام جنگل کاٹ کر پہاڑ کو صاف کر دیا ہے اور اب کوئی جنگلی جانور نہیں بچا۔

اس پہاڑ کے جنگل سے ہماری آبادیاں ضرورت کے مطابق ایندھن اور گھر بنانے کے لئے لکڑی حاصل کرتی تھیں۔ لیکن سرمایہ داروں نے اس بیش قیمت قدرتی وسیلہ کو ختم کر دیا ہے۔ علاقے کے لوگوں کے مویشیوں کے لیے یہ پہاڑ ایک قدرتی چراگاہ بھی تھے۔ گویا ان پہاڑوں سے انسان اور جانور دونوں زندگی کی ضروریات حاصل کر رہے تھے جو اب ممکن نہیں۔

اسی طرح ہزاروں کنال زرعی زرخیز زمین بھی کسانوں سے زبردستی لی گئی۔ فیکٹری والے سیمنٹ میں مٹی بھی استعمال کرتے ہیں تو جس جگہ سے مٹی نکالتے ہیں وہاں پر بہت گہری کھائیاں بن گئی ہیں۔ جن کی گہرائی سینکڑوں فٹ ہے۔ جب برسات میں یہ کھائیں پانی سے بھر جاتی ہیں تو اس سے علاقے کے لوگوں کا جانی و مالی نقصان بھی کافی ہوتا ہے۔

اب کسان زمینوں کو چھوڑ رہے ہیں اور فیکٹری کے مالکان کی نظر اب ان زمینوں پر ہے۔ وہ ان زمینوں کو خریدنا چاہتے ہیں، قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ نجکاری کی وجہ سے ایک تو لوگوں کی مزدوری ختم ہوئی، ماحول تباہ ہوا، اب کسان زراعت کو بھی چھوڑ رہے ہیں۔ آنے والی نسلوں کا مستقبل تاریک لگتا ہے۔ ان کسانوں اور مزدوروں کا مستقبل کیا ہوگا؟

اختتامیہ

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ ظلم کی اس پالیسی کا سارا کا سارا فائدہ سرمایہ درانہ نظام کو ہی ہے۔ اس نظام نے کسان مزدور کی محنت پر قبضہ کر کے اس کو بند گلی میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اب کسان اور مزدور کے پاس اس کے سوا کوئی چارا نہیں کہ اس ظالمانہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ ہم سب کسان اور مزدور سرمایہ داری نظام کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ہماری محنت پر قبضہ کرنے والے سرمایہ دار، تعداد میں بہت کم ہیں اور ہم آبادی کا 75 فیصد ہیں، اگر ہم سب کسان اور مزدور آپس میں اتحاد اور اتفاق کر لیں اور ایک پلیٹ فارم پر اکھٹے ہو جائیں تو ہم بڑی آسانی سے ان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے اپنا حق چھین سکتے ہیں۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری کا سرے سے خاتمہ کر سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے سب سے پہلے ہم سب کسان اور مزدوروں کی یکجہتی ضروری ہے اور یہ بات ذہن میں رکھنی ہے کہ یہ ہمارا کام ہے اور ہم ہی نے کرنا ہے۔ کامیابی کسان اور مزدور کے قدم ضرور چومے گی۔

C:\Users\KHALID\Desktop\challenge may to august 2013\New folder\3-Challenge may to august asif 9-12

پاکستان میں آسٹریلوی ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقی کا ایک جائزہ

تحریر: عدنان عمر

آسٹریلوی ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقی یا آسٹریلین ایڈ (AusAid) آسٹریلوی حکومت کا ایک ادارہ ہے جس کے ذریعے آسٹریلیا کی حکومت دیگر ممالک میں ترقیاتی پروگراموں کے لیے امداد فراہم کرتی ہے۔[1]

آسٹریلین ایڈ کا بنیادی مقصد غربت پر قابو پانے میں لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ آسٹریلین ایڈ اپنے خطے میں اور خطے سے باہر استحکام اور خوشحالی کو فروغ دے کر آسٹریلیا کے قومی مفادات کو بھی پروان چڑھاتا ہے۔ یہ ادارہ اپنی کوششوں کا مرکز ان علاقوں کو بناتا ہے جہاں وہ نمایاں تبدیلیاں لاسکے اور جہاں اس کے وسائل موثر اور بھرپور طریقے سے استعمال میں لائے جاسکیں۔[2]

آسٹریلین ایڈ کے مقاصد

آسٹریلین ایڈ کے مطابق ''پاکستان کی ایک تہائی آبادی شدید غربت کی زندگی گزار رہی ہے۔ پاکستان کی عالمی جغرافیائی و سیاسی اہمیت (global strategic significance) اور دونوں ممالک کے عوام کے مابین رابطوں میں اضافے سے ظاہر ہے کہ پاکستان کی ترقی میں حصہ دار بننے میں ہمارا طویل مدتی قومی مفاد ہے۔ پاکستان میں غریبوں کی بڑی تعداد اور وہاں ہماری محدود موجودگی ہماری امداد کے بھرپور اثرات کے لیے چیلنج ہے۔''[3]

آسٹریلین ایڈ کے مطابق وہ ملینیم ترقیاتی اہداف (Millennium Development Goals/MDGs) کو سامنے رکھتے ہوئے استحکام کی کوششوں، جمہوری طرز حکمرانی، اقتصادی ترقی کے حصول اور غربت میں کمی کے لیے پاکستان کو مدد فراہم کرتا ہے۔ پاکستان میں اس کی کوششوں کا مرکز تین بنیادی شعبے ہیں۔تحفظ حیات (صحت)، سب کے لیے مواقع (تعلیم) اور پائیدار معاشی ترقی (زراعت و دیہی ترقی)۔ طرز حکمرانی اور ہنگامی نظم ونسق (emergency management) آسٹریلین ایڈ کی ترجیحات میں دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ آسٹریلین ایڈ پاکستان میں صنفی مساوات کے لیے بھی مدد دیتا ہے۔[4]

آسٹریلین ایڈ کی آمد اور اس کا بجٹ

آسٹریلیا اور پاکستان نے اکتوبر 2011 میں ''آسٹریلیا پاکستان ترقیاتی شراکت داری'' (Australia Pakistan Development Partnership/APDP) کے نام سے ایک مفاہمت کی یاد داشت (MoU) پر دستخط کیے۔ پاکستان میں آسٹریلین ایڈ اسی مفاہمت کی یاد داشت کی روشنی میں کام کرتا ہے۔ معاہدے کے تحت غربت میں کمی لانے اور ملینیم ترقیاتی اہداف کے حصول میں پاکستان کی مدد کی جائے گی۔ اس کے جواب میں پاکستان ترقی کے لیے وسائل مختص کرے گا تاکہ ڈونرز (عطیہ دہندگان) کے مابین رابطے بہتر ہوں، پائیدار اور وسیع اقتصادی ترقی کی جانب بڑھا جائے۔

آسٹریلیا اپنی ترقیاتی امداد ابتدائی طور پر کثیرطرفہ اداروں،[5] این جی اوز اور دیگر ڈونرز کے ذریعے دیتا ہے اور اس کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ آسٹریلین ایڈ حکومت پاکستان کو براہ راست امداد نہیں دیتا بلکہ بڑے ڈونرز مثلاً عالمی بینک اور برطانیہ کے عالمی امدادی ادارے ڈی ایف آئی ڈی کے ذریعے دیتا ہے جن کا پاکستان میں مضبوط نظام موجود ہے۔[6]

آسٹریلیا نے مالی سال 02-2001 میں پاکستان کو 37 لاکھ امریکی ڈالرز سے زائد کی امداد دی تھی۔ آسٹریلوی امداد میں بتدریج سالانہ اضافہ ہوتا رہا۔ مالی سال 14-2013 میں اس امداد کا تخمینہ 87.9 ملین ڈالرز (9 ارب 42 کروڑ روپے سے زائد) لگایا گیا ہے۔[7]

آسٹریلین ایڈ کی سرگرمیاں

پاکستان میں آسٹریلین ایڈ مندرجہ ذیل شعبوں میں امدادی کاروائیوں میں مصروف ہے:

1۔ زراعت

اس شعبے میں آسٹریلیا پاکستان کو زرعی رابطہ پروگرام (Agriculture Sector Linkages Program/ASLP) کے تحت امداد فراہم کررہا ہے۔ آسٹریلیا کا ایک سرکاری ادارہ آسٹریلوی مرکز برائے عالمی زرعی تحقیق (Australian Centre for International Agricultural Research/ACIAR)[8] اس پروگرام کو چلا رہا ہے۔ آسٹریلین ایڈ کے مطابق ''آسٹریلیا زرعی پیداوار میں اضافے اور کسانوں اور دیہی آبادیوں کی آمدن میں بہتری لاکر پاکستان میں پائیدار معاشی ترقی کو فروغ دیتا ہے۔ ہم کھیتوں کے انتظام (فارم مینجمنٹ) کے طریقوں میں بہتری لارہے ہیں اور آبپاشی کے جدید طریقوں کو متعارف کروا رہے ہیں تاکہ فصلوں کی پیداوار بڑھے''۔[9] ASLP (اے ایس ایل پی) پاکستانی آم اور سٹرس پھلوں (کینوں، لیموں، چکوترا اور

اس نسل کے دوسرے پھل) کی برآمدات میں اضافے پر بھی کام کر رہا ہے۔[10]

آسٹریلیا کی پاکستانی زراعت کے لیے امداد 10-2009 میں دو ملین آسٹریلوی ڈالرز تھی جو 2013 میں بڑھ کر 15 ملین آسٹریلوی ڈالرز سالانہ یا پاکستان کو ملنے والی کل امداد کا 12.5 فیصد ہو جائے گی۔[11]

اے ایس ایل پی کے تحت 440 خواتین سمیت 465 افراد کو بٹیروں کی فارمنگ، کچن گارڈننگ اور نیم تیار اور تیار کھانے بنانے (food processing) کی تربیت دی گئی۔

آبپاشی کے جدید طریقوں کی آزمائشی مشقوں سے آم اگانے والوں کے پانی کے استعمال میں 66 فیصد کمی آئی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے 576 کسانوں کو تربیت دی گئی۔[12]

2۔ انفراسٹرکچر (بنیادی ڈھانچہ)

آسٹریلین ایڈ کے مطابق ''تیز اور مسلسل معاشی نشو و نما اور تجارت کے لیے انفراسٹرکچر کی کوالٹی اور اس کی پہنچ ضروری ہے''۔[13] پاکستان میں آسٹریلین ایڈ نے انفراسٹرکچر میں محدود کام کیا ہے۔ 2010 اور 2011 کے سیلاب زدہ علاقوں کی بحالی کے لیے 665 چھوٹے اور 445 کمیونٹی پراجیکٹ مکمل کیے جن میں نالیوں اور کنوؤں کی صفائی، آبپاشی کے نالوں (channels) کی مرمت، پانی و نکاسی آب کی فراہمی، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر شامل ہیں۔ آسٹریلین ایڈ کا کہنا ہے کہ وہ پاکستان میں دیہی انفراسٹرکچر کو نئے سرے سے کھڑا کرے گا اور بہتر بنائے گا، ساتھ ہی منڈی تک آسان رسائی اور نئے مہارتیں سیکھنے میں کسانوں کی مدد کرے گا۔[14]

3۔ ڈیری فارمنگ

اس شعبے میں آسٹریلین ایڈ نے 2007 سے اے ایس ایل پی ڈیری پروگرام شروع کر رکھا ہے۔ پروگرام کے مقاصد میں دودھیل جانوروں کے بچوں کو پالنے کے جدید اور منافع بخش طریقے متعارف کروانا، دودھ کی پیداوار کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ فروخت کے مزید منافع بخش طریقوں کو متعارف کروانا اور دودھ کی پیداوار سے فروخت تک کے عمل میں شریک افراد کو تربیت فراہم کرنا شامل ہیں۔[15] پاکستانی سائنس دانوں کی ڈیری کے شعبے میں تحقیقی صلاحیتوں کو مزید اجاگر کرنا اور قومی اور صوبائی تحقیقی اداروں اور این جی اوگروپس سے باہمی روابط و تعاون بڑھانا بھی اس پروگرام کے مقاصد ہیں۔[16]

اے ایس ایل پی ڈیری پروگرام کے تحت:

- پنجاب کے پانچ اضلاع (اوکاڑہ، قصور، پاکپتن، جہلم اور بھکر) کے گاؤں، ڈیری فارمز اور توسیعی کارکنان کی نشاندہی، انتخاب اور رجسٹریشن کا مرحلہ مکمل کیا گیا۔
- جانوروں کی خوراک، صحت، دیکھ بھال، افزائش نسل اور ڈیری فارمز کی معاشیات کے بارے میں مکمل معلومات اکٹھی کی گئیں۔
- مختلف اضلاع میں محکمہ لائیو اسٹاک پنجاب اور سندھ میں تعینات شدہ جانوروں کے ڈاکٹروں کو کھیت مشیر (farm advisers) کا درجہ دے کر ڈیری ٹیم کا حصہ بنایا گیا تاکہ وہ اس پراجیکٹ کے تحت موجودہ ڈیری فارمنگ کے انتظامی امور میں بہتری لاکر مستقل بنیادوں پر پیداوار بڑھانے کا موجب بن سکیں۔
- افزائش حیوانات و تحقیقی ادارہ بہادر نگر، اوکاڑہ میں ساہیوال نسل کے بچھڑوں کی پرورش پر کامیاب تجربہ کیا گیا جس کا بنیادی مقصد بوہلی کو مناسب وقت پر دینے سے حاصل ہونے والی قوت مدافعت کا موازنہ کرنا اور اس کے بڑھوتری پر مثبت اثرات کا جائزہ لینا تھا۔
- توسیعی کارکنان کی پہلی تربیتی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔
- زیادہ سے زیادہ ڈیری فارمرز تک توسیعی مواد کی رسائی کے لیے ویب سائٹ کا اجراء کیا گیا۔[17]

4۔ مویشی فارمنگ

15 اپریل، 2013 کو آسٹریلین ایڈ نے ''بلوچستان کے سرحدی علاقوں کو آسٹریلوی مدد (Australian Assistance to the Balochistan Border Areas/AusABBA)'' کے نام سے ایک کروڑ تیس 30 لاکھ امریکی ڈالرز کے منصوبے کا اعلان کیا۔ یہ منصوبہ اقوام متحدہ کے خوراک و زراعت کے ادارے (Food and Agriculture Organization/FAO) نے حکومت پاکستان، بلوچستان حکومت اور آسٹریلین ایڈ کے اشتراک سے تیار کیا ہے۔ دراصل یہ منصوبہ امریکی عالمی امدادی ادارے ''یو ایس ایڈ (USAID)'' کے منصوبے بلوچستان زرعی پراجیکٹ (Balochistan Agriculture Project/BAP) کا تسلسل ہے جو بلوچستان کے شمالی اضلاع میں آٹھ سال سے چل رہا ہے۔ آسٹریلین ایڈ کی شمولیت کے بعد اس امریکی منصوبے کو صوبے کے چھ نئے اضلاع تک پھیلا دیا گیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت بلوچستان سے 15 مویشی پال مرد اور عورتوں پر مشتمل گروہ کو رواں سال جنوری میں آسٹریلیا کا دورہ کروایا گیا۔ وہاں انھیں بھیڑوں کو سنبھالنے، اون اتارنے اور اون کے استعمال کی تربیت دی گئی تاکہ بلوچستان میں اس شعبہ کی آمدن میں اضافہ ہو۔[18]

5۔ تعلیم

آسٹریلین ایڈ کے مطابق اس نے جون 2012 تک 15 لاکھ 60 ہزار بچوں کو مفت درسی کتابیں فراہم کیں اور مڈل اور ہائی اسکول کی ایک لاکھ 46 ہزار 560 لڑکیوں کو وظائف دیے۔ 2013 میں 55 طلباء کے لیے ماسٹرز کی سطح کے تعلیمی وظیفے مقرر کیے گئے ہیں۔[19] 2012 میں آسٹریلیا پاکستان زرعی تعلیمی وظیفے کے تحت چاروں صوبوں اور کشمیر سے تعلق رکھنے والے 22 پیشہ ور افراد کو آسٹریلیا کی کوئنز لینڈ یونیورسٹی میں ''دیہی علاقوں میں غریب مفید مارکیٹ کی ترقی (Pro-poor Market Development in Rural Areas)'' پر چار ہفتے کا کورس کروایا گیا۔[20]

6۔ صحت

- 2008 سے لے کر اب تک خیبر پختونخوا میں 8 ہزار 966 دائیوں کی تربیت کی گئی۔ ان میں سے 4 ہزار 800 افراد کو مختلف جگہوں پر تعینات کر دیا گیا ہے۔
- آنکھوں میں موتیے کے 13 ہزار آپریشن کیے گئے، 52 ہزار 700 افراد کی آنکھوں کی بیماریوں کا علاج کیا گیا۔[21]

آسٹریلین ایڈ اوپر بیان کیے گئے شعبہ جات کے علاوہ طرز حکمرانی اور ہنگامی نظم و نسق کے شعبوں میں بھی پاکستان کو امداد فراہم کر رہا ہے۔

آسٹریلین ایڈ کی سرگرمیوں کا تنقیدی جائزہ

آسٹریلین ایڈ کی دستاویزات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک ترقیاتی امدادی ادارے کی حیثیت سے آسٹریلین ایڈ کے مقاصد ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ مثلاً آسٹریلین ایڈ کہتا ہے کہ ''اس کا بنیادی مقصد غربت پر قابو پانا ہے''۔ لیکن اسی جملے میں یہ بھی کہتا ہے ''آسٹریلین ایڈ اپنے خطے میں اور خطے سے باہر استحکام اور خوشحالی کو فروغ دے کر آسٹریلیا کے قومی مفادات کو بھی پروان چڑھاتا ہے''۔ یہاں آسٹریلیا نے پوری دنیا میں نہیں بلکہ اپنے خطے اور خطے سے باہر استحکام اور خوش حالی یعنی غربت پر قابو پانے کی بات کی ہے اور پھر اس کو اپنے قومی مفادات سے جوڑ کر اپنی امداد کا دائرہ تنگ کر دیا ہے۔ اس خیال کی تائید آسٹریلین ایڈ کی ہی ایک اور دستاویز سے ہوتی ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ آسٹریلیا امداد دینے کا فیصلہ کرتے وقت امداد وصول کرنے والے ممالک کی ترقیاتی ترجیحات، غربت کے جائزے کے علاوہ اپنا قومی مفاد بھی دیکھتا ہے۔[22] آسٹریلیا کے اس اعتراف سے ظاہر ہے کہ وہ صرف اس ملک کو مدد دیتا ہے جس سے اس کا کوئی قومی مفاد وابستہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں آسٹریلیا امداد کے ذریعہ اپنے قومی مفادات کو پروان چڑھاتا ہے۔ تو کیا دنیا کے مختلف ممالک کو امداد دینے والے اس ادارے کا یہ کہنا غلط ہے کہ اس کا بنیادی مقصد غربت پر قابو پانا ہے؟ آیئے پاکستان کو مثال بنا کر آسٹریلوی دعوے کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پاکستان میں آسٹریلین ایڈ کئی شعبوں میں امداد دے رہا ہے، مثلاً انفراسٹرکچر جس میں اس کی امداد محدود ہے لیکن بعض ایشیائی ممالک میں انفراسٹرکچر میں آسٹریلین ایڈ کی سرگرمیاں دیکھیں تو پاکستان پر اس کے ممکنہ اثرات کو سمجھ سکتے ہیں۔

آسٹریلین ایڈ کے اپنے الفاظ میں:

> ''آسٹریلوی امداد آسٹریلیا کے لیے تجارت کے دروازے بھی کھولتی ہے خصوصاً ایشیاء کی ابھرتی ہوئی معیشتوں سے مثلاً انڈونیشیا اور ویتنام جو آسٹریلوی سامان اور خدمات کی تیزی سے اہم ہوتی ہوئی منڈیاں بن رہے ہیں۔ انفراسٹرکچر میں سرمایہ کاری مقامی ٹھیکے داروں اور مزدوروں کو نوکری مہیا کرتی ہے اور مارکیٹ تک وسیع تر رسائی بھی دیتی ہے جس سے آمدن میں اضافہ ہوتا ہے۔ تیز اور مسلسل معاشی نشو و نما اور تجارت کے لیے انفراسٹرکچر کا معیار اور اس کی پہنچ ضروری ہے۔ انفراسٹرکچر تجارت کی راہ میں حائل مادی رکاوٹوں کو دور کرتا ہے، بالخصوص سمندر سے محروم (landlocked) اور کمزور ممالک کے لیے۔ انفراسٹرکچر تجارتی سامان کی لاگت کم کرتا ہے جس کے نتیجے میں برآمدی اور درآمدی منڈیاں کھلنے سے مسابقت بڑھتی ہے''۔[23]

آسٹریلین ایڈ آگے لکھتا ہے کہ '' آسٹریلیا اپنے اس انفراسٹرکچر پروگرام کی ترسیل (delivery) کے لیے اپنے ترسیل کے نظام، کثیر طرفہ اداروں، غریبوں کو پائیدار خدمات فراہم کرنے والے دیگر سرکاری اور نجی شعبوں کو استعمال کرے گا''۔[24] واضح رہے کہ یہ الفاظ آسٹریلین ایڈ کے ہیں، آسٹریلیا کے سرکاری تجارتی ادارے آسٹریڈ (Austrade) کے نہیں۔ ان الفاظ سے امداد وصول کرنے والے ملک میں آسٹریلیا کے تجارتی عزائم کا صاف پتہ چلتا ہے کہ آسٹریلیا ان ممالک کے انفراسٹرکچر کو مضبوط بنا کر ان ممالک سے تجارت کا فروغ چاہتا ہے تاکہ اس کی مصنوعات کی ان ممالک میں کھپت ہو۔ اس حوالے سے اس نے خود انڈونیشیا اور ویتنام کی مثال دی ہے۔

آسٹریلین ایڈ مزید کہتا ہے کہ ''آسٹریلیا اور دیگر ڈونرز کی جانب سے ملنے والی ترقیاتی امداد، انفراسٹرکچر کی تعمیر کی ضروریات کا ایک چھوٹا حصہ ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ انفراسٹرکچر اور اقتصادی ترقی میں ہماری شمولیت میں تیزی آنی چاہیے تاکہ ہماری سرمایہ کاری کے غریبوں پر اثرات زیادہ سے زیادہ ہوں اور ہمارے موثر اور بھرپور امدادی پروگرام کو مدد ملے۔ ہمیں لازماً نجی شعبے کی سرمایہ کاری کو تیز کرنا چاہیے اور امداد وصول کرنے والی حکومتوں کو ان کے اپنے وسائل کے موثر تر استعمال

میں مدد دینی چاہیے'۔[25] یہاں آسٹریلیا خود ہی امداد وصول کرنے والے ملک میں نجی سرمایہ کاری کی ضرورت اور اہمیت بیان کررہا ہے۔ نجی سرمایہ کاری کون کرے اس کا ذکر وہ ان الفاظ میں کررہا ہے۔ ''آسٹریلیا کا انفراسٹرکچر میں تجربہ اور مہارتیں ہمارے پارٹنر ممالک سے انتہائی متعلق ہیں۔ آسٹریلیا کلیدی شعبوں میں مانا ہوا عالمی رہنما ہے جیسے جدید سرکاری نجی شراکت داری، آبی وسائل کا مربوط نظم ونسق، پائیدار شہری منصوبہ بندی و ترقیات اور موسمی حالات میں شدید تنوع کے اثرات کو کم کرنا''۔[26] یعنی یہاں آسٹریلین ایڈ اپنے ملک کی نجی کمپنیوں کی تجارتی خدمات خود پیش کررہا ہے۔ آسٹریلیا ایک تو طلبگار ملک کو اس کی ترجیحات کے مطابق نہیں بلکہ اپنی ترجیحات کے مطابق اپنی مرضی کے شعبوں میں امداد دے رہا ہے اور پھر اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اس امداد کو وہ طلبگار ملک میں نافذ بھی اپنے مہارتوں کے ذریعے کرنا چاہتا ہے۔ مزید یہ کہ آسٹریلیا اپنی کوششوں کو عالمی سرمایہ دارانہ ایجنڈے سے جوڑتے ہوئے یہ بھی کہہ رہا ہے کہ ''کامیاب ترقی کے لیے انفراسٹرکچر کی اہمیت کو واضح طور پر G-20 ممالک کے معاشی ایجنڈے میں ضم کیا جاسکتا ہے۔ انفراسٹرکچر، سیئول ڈویلپمنٹ کونسینسس فار شیئرڈ گروتھ (Seoul Development Consensus for Shared Growth) کے نو کلیدی ستونوں میں سے ایک ستون ہے جنھیں نومبر 2010 میں سیئول اجلاس میں اپنایا گیا تھا۔''[27] آسٹریلیا کے ان عزائم سے صاف ظاہر ہے کہ وہ امداد وصول کرنے والے ممالک میں انفراسٹرکچر کی مضبوطی کے ذریعے اپنی کمپنیوں کی مصنوعات کی منڈی قائم کرنا چاہتا ہے۔

پاکستان کو امداد دینے کی بات ہو تو یہاں بھی آسٹریلیا کو قومی مفاد نظر آتا ہے۔ پاکستان میں غربت کے ذکر کے بعد آسٹریلین ایڈ کہتا ہے کہ ''پاکستان کی عالمی جغرافیائی و سیاسی اہمیت (global strategic significance) اور دونوں ممالک کے عوام کے مابین رابطوں میں اضافے سے ظاہر ہے کہ پاکستان کی ترقی میں حصہ دار بننے میں ہمارا طویل مدتی قومی مفاد ہے''۔ آسٹریلیا کے پاکستان میں قومی مفادات کیا ہیں، اس کی ایک مثال آسٹریلیا کی پاکستانی ڈیری فارمنگ صنعت میں دلچسپی ہے۔

پاکستان میں آسٹریلیا کے سفیر ایچ ای پیٹر ہیورڈ کا کہنا ہے کہ گذشتہ چھ سالوں سے آسٹریلیا سے گایوں کے ریوڑ کی درآمد نے پاکستان میں انتہائی کامیاب ڈیری کی صنعت کی بنیاد رکھی ہے۔ ایسے بہت سے شعبے ہیں جن میں دونوں ملکوں کے تعاون سے ڈیری کے شعبے کو مزید فروغ مل سکتا ہے۔ انھوں نے آسٹریلین ایڈ کے پروگرام اے ایس ایل پی ڈیری کو بھی خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ پروگرام آسٹریلیا کی فارمنگ ٹیکنالوجی کی مدد سے پاکستانی گوالوں کی غربت میں کمی کی کوشش کررہا ہے۔[28] یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آسٹریلیا سے پاکستان ڈیری مویشیوں کی برآمد 2007 میں شروع ہوئی اور اے ایس ایل پی ڈیری پروگرام بھی 2007 میں شروع کیا گیا۔ یعنی ڈیری کے شعبے میں آسٹریلیا کی پاکستان سے تجارت کے ساتھ ہی پاکستانی ڈیری فارمنگ کو آسٹریلوی امداد بھی ملنا شروع ہوگئی تاکہ گوالوں کی جدید فارمنگ ٹیکنالوجی کے مطابق تربیت کرکے انھیں آسٹریلیوی فارمنگ ٹیکنالوجی اور ڈیری مویشیوں کا زیادہ سے زیادہ خریدار بنایا جائے۔

یہ قابل ذکر ہے کہ آسٹریلیا دنیا کو ڈیری مویشی برآمد کرنے والے سب سے بڑے ممالک میں سے ایک ہے اور دنیا بھر کو کئی اقسام کے ڈیری مویشی برآمد کرتا ہے۔ ان اقسام میں سے ایک قسم آسٹریلین فرائسین ساہیوال (Australian Friesian Sahiwal) بھی ہے جسے آسٹریلیا، آسٹریلوی نسل کہتا ہے۔ 1960 میں آسٹریلوی ریاست کوئنزلینڈ حکومت نے اس نسل کی تیاری شروع کی۔ یہ پاکستانی گائے کی نسل ''ساہیوال'' اور آسٹریلوی نسل Holstein-Friesian (ہول اسٹین فرائسین) کے ملاپ سے آسٹریلیا کے استوائی علاقوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔[29] یعنی آسٹریلیا پاکستانی نسل کی ایک گائے کو استعمال کرتے ہوئے ایک نئی نسل بنا رہا ہے اور اسے پاکستان سمیت دنیا بھر میں بیچ کر منافع کما رہا ہے۔ یہ ہمارے جانوروں کے جینیاتی مواد کی کھلی چوری ہے۔

پاکستان میں کئی گوالے زیادہ دودھ کی لالچ میں آسٹریلیا سے گائے خرید تو رہے ہیں لیکن انھیں پالنے میں گوالوں کو کئی مسائل کا سامنا ہے۔ دیسی ساہیوال نسل اور آسٹریلوی گائے میں موازنے کے لیے ہم نے چند گوالوں سے رابطہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ آسٹریلوی گائے موسم کی سختی برداشت نہیں کرتی۔ سردی میں اسے نزلہ زکام ہوجاتا ہے، اس کے رہنے کی جگہ پر آگ جلا کر رکھنی پڑتی ہے۔ اس کے برعکس ساہیوال گائے سردی برداشت کرتی ہے اور اسے گرم کمرے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آسٹریلوی گائے کی خوراک زیادہ ہے اس لیے اس کے چارے پر خرچہ زیادہ آتا ہے جبکہ دیسی گائے کی خوراک کم ہے، پھر وہ چارے کے علاوہ باہر سے بھی گھاس چرآتی ہے۔ چارے کے اس خاص انتظام کی وجہ سے آسٹریلوی گائے روزانہ 24 کلو تک دودھ دیتی ہے لیکن اس کا دودھ پانی کی طرح پتلا ہوتا ہے جسے گاؤں والے استعمال کرنا پسند نہیں کرتے۔ ساہیوال گائے روزانہ 10 سے 12 کلو دودھ دیتی ہے لیکن اس کا دودھ گاڑھا ہوتا ہے اور اس کی دہی اور لسی بہت مزیدار ہوتی ہے۔ گوالوں نے یہ بھی بتایا کہ دیسی گائے کا گوشت ذائقہ دار اور بیماریوں سے پاک ہوتا ہے کیوں کہ یہ گائے آسٹریلوی گائے کی طرح بیماریوں میں مبتلا نہیں رہتی۔ لوگ خالص نسل ہونے کی وجہ سے ساہیوال نسل کے بچھڑے کو خریدنا پسند کرتے ہیں، اسی لیے یہ مہنگا بکتا ہے۔

پاکستانی زراعت کو امداد دینے میں بھی یہی پالیسی ہے۔ آسٹریلین ایڈ کے مطابق اے ایس ایل پی کے مقاصد میں شامل ہیں:

1۔ آسٹریلیا کے علم اور مہارتوں کو پاکستان کی زرعی تجارت کے کلیدی شعبوں تک منتقل کرنا تاکہ منافع اور برآمد کے مواقع بڑھائے جائیں۔

2۔ مشترکہ تحقیق و ترقی کے ذریعے چھوٹے کسان کی غربت میں کمی کی کوشش کی جائے۔

3۔ پاکستان کے تحقیق، ترقی اور توسیعی نظام کی صلاحیت بڑھائی جائے تاکہ زرعی تجارت اور کسانوں تک مطلوبہ اور عملی تحقیقی نتائج (targeted and practical research outputs) پہنچائے جاسکیں۔[30]

آسٹریلین ایڈ پاکستان کی زرعی تجارت کو آسٹریلیا سے ''علم اور مہارتوں'' کی پاکستان منتقلی سے جوڑ رہا ہے۔ اس منتقلی کو اس نے آسٹریلین ایڈ کے ذریعے شروع میں تو جزوی طور پر مفت فراہم کیا تاہم یہ منتقلی اب باقاعدہ تجارت بن چکی ہے۔ مثلاً اکتوبر 2011 میں آسٹریلوی وزیر خارجہ نے کہا کہ پاکستان میں 2010 کے سیلاب کے بعد آسٹریلوی امداد سیلاب زدہ علاقوں کے 30 ہزار سے زائد کسانوں کو بیج اور مصنوعی کھاد فراہم کرچکی ہے تاکہ وہ پھر سے فصلیں اگا کر اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔[31] اسی طرح 2011 کے آخر میں پاکستان کی درخواست پر آسٹریلیا نے چارٹن سے زیادہ سورج مکھی کے بیج سندھ کے سیلاب زدگان کی امداد کے لیے بھیجے تاکہ وہ سورج مکھی کی نقدآور فصل اگا کر اپنی معاشی حالت بہتر بناسکیں۔[32] جون 2013 میں آسٹریلوی وزارت خارجہ وتجارت کے ڈپٹی سیکرٹری پال گرگسن نے اسلام آباد میں خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ 2011 میں دونوں ممالک کے مابین 586 ملین آسٹریلوی ڈالرز کی تجارت ہوئی تھی جو 2012 میں بڑھ کر 879 ملین آسٹریلوی ڈالرز ہوگئی۔ آسٹریلوی سفیر نے 2012 کی اس تجارت کے اعداد و شمار بھی پیش کیے لیکن 879 ملین کے بجائے صرف 660 ملین ڈالرز کی تجارت کی تفصیل بتائی جو درج ذیل ہے:[33]

2012 میں پاکستان اور آسٹریلیا کے مابین تجارت

پاکستان سے آسٹریلیا برآمدات (آسٹریلوی ڈالرز)	آسٹریلیا سے پاکستان درآمدات (آسٹریلوی ڈالرز)
لینن: 71 ملین	تیل کے بیج: 293 ملین
لباس: 32 ملین	سبزیاں: 143 ملین
چاول: 18 ملین	کوئلہ: 54 ملین
کپاس: 10 ملین	کپاس: 39 ملین
برآمدات: 131 ملین	درآمدات: 529 ملین
برآمدات و درآمدات پر مبنی کل تجارت: 131+529=660 ملین ڈالرز	

اب آسٹریلین ایڈ کی ویب سائٹ سے رجوع کرتے ہیں جہاں درج ہے کہ مالی سال 2012-2013 میں پاکستان کو ملنے والی آسٹریلوی امداد کا تخمینہ 85.7 ملین امریکی ڈالرز یا 90.64 ملین آسٹریلوی ڈالرز ہے۔ مالی سال 2011-2012 میں یہ آسٹریلوی امداد 87.6 ملین امریکی ڈالرز یا 92.7 ملین آسٹریلوی ڈالرز تھی۔[34] اگر اس میں سے بڑی رقم 92.7 ملین آسٹریلوی ڈالرز کا بھی انتخاب کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں کیلنڈر سال 2012 میں زیادہ سے زیادہ 92.7 ملین آسٹریلوی ڈالرز امداد کی شکل میں آئے جبکہ اس دوران کل تجارت 879 ملین آسٹریلوی ڈالرز ہوئی۔ اس تجارت میں پاکستانی برآمدات کا حصہ 131 ملین ڈالرز اور آسٹریلیا کا 529 ملین ڈالرز ہے جبکہ باقی 219 ملین ڈالرز کا ہمارے پاس کوئی حساب نہیں۔ اگر ہم باقی 219 ملین ڈالرز کو بھی پاکستانی برآمدات کے کھاتے میں ڈال دیں تو پاکستانی برآمدات کا حصہ 350 ملین ڈالرز بنتا ہے جو کہ پھر بھی آسٹریلیا کے 529 ملین ڈالرز سے کم ہے۔ سال 2012 میں آسٹریلین ایڈ سے پاکستان کو جو امداد ملی اگر اسے بھی پاکستانی برآمدات میں جوڑ لیں تو 442.7 ملین ڈالرز ملتا ہے۔ یعنی اتنے جوڑ توڑ کے بعد ہم نے اندازہ لگایا کہ پاکستان میں سال 2012 میں زیادہ سے زیادہ 442.7 ملین آسٹریلوی ڈالرز آئے جبکہ پاکستان سے زرمبادلہ کی شکل میں 529 ملین آسٹریلوی ڈالرز گئے۔ یوں پاکستان کو کم از کم 86.3 ملین آسٹریلوی ڈالرز کا خالص خسارہ ہوا۔ غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ایک طرف تو آسٹریلین ایڈ پاکستانی کسانوں میں اپنے بیج مفت بانٹ کر انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے دعوے کررہا ہے لیکن دوسری طرف ہماری زرعی معیشت کو اپنے بیجوں کا محتاج کررہا ہے کیوں کہ آسٹریلیا کی پاکستان کو برآمدات کی فہرست میں تیل کا بیج سب سے اوپر ہے۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان میں آسٹریلیا سے جتنی مقدار میں پیسہ آرہا ہے اس سے کہیں زیادہ مقدار میں واپس آسٹریلیا جارہا ہے۔

اوپر تیل کے بیجوں کا ذکر کیا گیا ہے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پاکستانی حکومت گذشتہ کئی سال سے ملک میں سورج مکھی کی کاشت میں اضافے کی کوشش میں مصروف ہے اور اسی لیے سورج مکھی کے تیل کے بجائے سورج مکھی کے بیج آسٹریلیا اور دیگر ممالک سے خرید رہی ہے۔ یہ سلسلہ پاکستان میں بیج کے شعبہ کو آزاد تجارت کے لیے کھول دینے کے بعد شروع کیا گیا۔ پاکستان میں بھی سورج مکھی کا بیج موجود تھا لیکن باہر سے آنے والے بیج کو کمپنیوں نے بڑے پیمانے پر بیج کی منڈی میں پیش کرنا شروع کردیا۔ 2005 میں روٹس فار ایکوٹی کی جانب سے سندھ کے ضلع بدین میں 250 کلومیٹر سے زائد کے علاقے میں 24 گاؤں میں کی گئی تحقیق سے پتہ چلا کہ بدین میں سورج مکھی کی کاشت میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے، تاہم زمینداروں نے سورج مکھی کی نقدآور فصل سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی لالچ میں ہاریوں کو فصل میں سے حصہ دینے سے انکار کردیا جس کے باعث وہ کھیت مزدور کے طور پر کام کرنے پر مجبور تھے۔ اس تصویر کے مزید تاریک رخ بھی ہیں، مثلاً سورج مکھی کی کاشت سے سب سے زیادہ عورتیں متاثر ہوئیں کیوں کہ سورج مکھی کی بوائی کے وقت مشینوں کے استعمال نے ان سے ان کی مزدوری چھین لی۔ چنائی کا وقت آیا تو سورج مکھی کے پودے کی سختی اور لمبائی کی وجہ سے بیج اتارنے میں انھیں جسمانی

مشقت کا سامنا کرنا پڑا لیکن دن بھر تپتے سورج کی نیچے شدید مشقت کے عوض انھیں صرف 30 سے 40 روپے مزدوری دی جاتی ہے جو ان کا اپنا پیٹ بھرنے کے لیے بھی ناکافی ہے۔[35]

حکومت سورج مکھی کی کاشت کو فروغ دے کر خوردنی تیل کی درآمد پر آنے والے اخراجات میں کمی تو لا رہی ہے لیکن اس کی قیمت چھوٹے اور بے زمین کسان فاقہ کشی کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ پاکستان میں سورج مکھی کے بیجوں کی 90 فیصد مارکیٹ پر چار غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا قبضہ ہے جو آسٹریلیا اور دیگر ممالک سے بیج درآمد کر کے پاکستان میں فروخت کر رہی ہیں۔ ان درآمدی بیجوں پر انحصار کا نتیجہ 2004 میں سامنے آیا جب ملکی اخبارات میں یہ خبریں آئیں کہ آسٹریلیا میں قحط کی وجہ سے پاکستان میں سورج مکھی کے بیجوں کی قلت ہوگئی ہے جس کی وجہ سے کسانوں کو بیج 900 سے 1200 روپے فی کلو کے نرخ پر فروخت کیا جا رہا ہے۔[36] کیا آسٹریلین ایڈ نے 2010 اور 2011 میں اسی لیے سندھ کے کسانوں کو مفت سورج مکھی کے بیج فراہم کیے تھے کہ ہمارے کسان آئندہ آسٹریلوی بیج کے مستقل خریدار بن کر غیر ملکی کمپنیوں کے محتاج بن جائیں؟ کیا یہی وہ پائیدار معاشی ترقی اور غربت میں کمی ہے جس کا خواب آسٹریلین ایڈ ہمیں دکھا رہا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ آسٹریلیا جہاں جہاں پاکستان کو امداد دے رہا ہے وہاں وہاں اپنی عام برآمدات کو بڑھانے کی کوششوں میں بھی مصروف ہے۔ جیسے وہ اے ایس ایل پی کے تحت پاکستان میں سٹرس پھلوں کی برآمدات میں اضافے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے پنجاب میں سہ فریقی زرعی تجارت کے منصوبے کا اعلان کیا گیا ہے جس کے تحت پاکستانی باغات، آسٹریلوی مہارتوں اور متحدہ عرب امارات کی سرمایہ کاری کے مابین اشتراک قائم کیا جائے گا۔ آسٹریلوی مہارتیں جنوبی آسٹریلیا کی کمپنی نپیز فروٹ جوسز (Nippy's Fruit Juices) اور متحدہ عرب امارات کی سرمایہ کاری وہاں کی کمپنی اینشا کارپوریشن (ENSHAA Corporation) فراہم کرے گی۔ اس پراجیکٹ کے تحت آسٹریلوی مہارتوں کو استعمال کرتے ہوئے سٹرس پھل سے جوس بنا کر اسے برآمد کیا جائے گا۔ آسٹریلین ایڈ کا کہنا ہے کہ یہ پراجیکٹ آسٹریلوی کمپنی کے لیے ابھرتی ہوئی اور بڑی مارکیٹ کے دروازے کھولے گا۔ پنجاب حکومت نے اس منصوبے کو خوش آمدید کہا ہے۔[37] اس سے صاف ظاہر ہے کہ آسٹریلیا اپنی نجی کمپنی کو سٹرس کی منڈی میں قدم جمانے کا موقع فراہم کرنے کے لیے پاکستان کو آسٹریلین ایڈ کے ذریعے امداد فراہم کر رہا ہے۔

پاکستان میں آموں کی پیداوار میں آسٹریلیا کی دلچسپی بھی معنی خیز ہے۔ آسٹریلین ایڈ اپنی ویب سائٹ میں لکھتا ہے کہ ایڈ کی جانب سے 30 جون، 2012 تک آبپاشی کے جدید طریقوں کی آزمائشی مشقوں سے آم اگانے والوں کے پانی کے استعمال میں 66 فیصد کمی آئی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے 576 کسانوں کو تربیت دی گئی۔ ادھر میڈیا رپورٹس کے مطابق کئی سال کی کوششوں کے بعد 2013 میں آسٹریلیا نے پاکستان سے آم کی درآمد کی منظوری دے دی کیوں کہ پاکستان نے گرم پانی کی ٹریٹمنٹ (Hot Water Treatment) اور فوڈ پراسیسنگ کا آسٹریلوی معیار حاصل کر لیا تھا۔ منظوری کے بعد پاکستان سے آسٹریلیا کو آموں کی پہلی کھیپ اگست 2013 میں بھیجی گئی۔ چونکہ مشرق وسطٰی کے مقابلے میں آسٹریلیا پاکستانی تاجروں سے آم سات گنا مہنگا خرید رہا ہے اس لیے پاکستانی تاجر یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ 2015 تک پاکستان سے آسٹریلیا کو آموں کی برآمد ایک ہزار ٹن تک پہنچ جائے گی۔[38] حکومت پاکستان کو اس کھیپ سے حاصل ہونے والا زرمبادلہ اپنی جگہ لیکن یہاں بھی آسٹریلین ایڈ اپنی کمپنیوں کی جگہ بنانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ آموں کو کم پانی سے اگانے کا جدید طریقہ آزمائشی طور پر تو مفت فراہم کیا گیا ہے تاہم اسے کمرشل بنیادوں پر چلانے کے لیے آسٹریلوی مشینری اور ماہرین کی خدمات کے دروازے پاکستان میں کھول دیے گئے ہیں۔ اسی طرح فوڈ پراسیسنگ کے شعبے میں بھی پاکستانیوں کو گزشتہ سال تک تربیت فراہم کی گئی جو کہ آسٹریلیا کی جدید فوڈ پراسسنگ ٹیکنالوجی کی منافع بخش بنیادوں پر پاکستان منتقلی کا آغاز ہوسکتا ہے۔ زراعت کے شعبے میں آسٹریلین ایڈ کو زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے وائس چانسلر کی بھی معاونت حاصل ہے۔[39]

سٹرس اور آم کی مثال پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ آسٹریلیا کہیں بھی تجارت کے موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دے رہا لیکن اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے جو زیادہ اہم ہے۔ پاکستانی پھلوں کے باہر جانے سے ہمارے عوام کو نقصان کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔ زیادہ سے زیادہ پھلوں کی برآمد کا مطلب ملک میں ان کی قلت ہے جس سے ان کے دام اتنے بڑھ جائیں گے کہ غریب اور نچلے متوسط طبقے کی پہنچ سے یہ پھل تو پہلے ہی باہر ہیں، اب درمیانے متوسط طبقے کی قوت خرید سے بھی باہر نکل جائیں گے۔ پھر ہوگا یہ کہ ان پھلوں کی برآمد سے منافع ہماری برآمدی کمپنیاں کمائیں گی، پھلوں کے صحت بخش اجزاء سے درآمدی ممالک کے عوام فائدہ اٹھائیں گے اور ہمارے عوام اور کسانوں کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا، نہ غذا، نہ صحت نہ دولت۔

آسٹریلیا سے علم اور مہارتوں کی پاکستان منتقلی میں تعلیم کا شعبہ بھی آئے گا۔ 2012 میں 22 پاکستانی طلباء کو تعلیمی وظائف پر مختصر کورس کے لیے آسٹریلیا بھیجا گیا اور 2013 میں 55 طلباء کے لیے ماسٹرز کی سطح کے تعلیمی وظیفے مقرر کیے گئے ہیں۔ آسٹریلوی ڈپٹی سیکرٹری برائے وزارت خارجہ و تجارت پال گرگسن نے پاکستان کے کان کنی (mining) کے شعبے کی ترقی کے لیے بھی آسٹریلوی تعاون کا اعلان کیا اور کہا کہ آسٹریلیا کی بین الاقوامی ترقیاتی امداد کے تحت اس شعبے میں طلباء کو تعلیمی وظائف دیے جائیں گے۔ یہ تو امداد کی بات تھی اب تجارت کی طرف آتے ہیں۔ اسی خطاب میں پال گرگسن کہہ رہے ہیں کہ برطانیہ کے بعد آسٹریلیا پاکستانی طلباء کے لیے سب

سے مقبول ملک ہے۔ 2002 سے 2005 کے درمیان آسٹریلیا کی درس گاہوں میں پاکستانی طلباء کے داخلے 25 فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھے ہیں۔ اس وقت آسٹریلیا میں 11 ہزار سے زائد پاکستانی طلباء کا اندراج ہے۔[40] آسٹریلوی سفیر نے تو لفظ ''مقبول'' استعمال کیا لیکن آسٹریلین ایڈ کی ایک دستاویز نے صاف الفاظ میں بتایا ہے کہ ''امریکہ اور برطانیہ کے بعد آسٹریلیا پاکستانی طلباء کے لیے سب سے بڑی منڈی بن گیا ہے''۔[41] یعنی آسٹریلیا تعلیم کے شعبے میں بھی پاکستانیوں سے کما رہا ہے۔

آسٹریلین ایڈ اور تجارت کے آسٹریلوی ڈپٹی سیکرٹری کے بیانات کے تجزیے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آسٹریلیا تعلیم کے شعبے میں چند طلباء کو اس لیے وظائف دے رہا ہے تاکہ اس سے آسٹریلیا کے تعلیم کے منافع بخش کاروبار کو مزید فروغ حاصل ہو۔ پال گرگسن نے پاکستان کے کان کنی کے شعبے کی ترقی کے لیے آسٹریلوی امداد سے دو نئے تعلیمی وظائف کا بھی اعلان کیا جن کے تحت کان کنی کے شعبوں میں علم، تکنیکی مہارت اور انتظامی امور کی تعلیم دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ان سینئر پاکستانی عہدیداران اور مڈ کیریئر پروفیشنلز کو بھی کان کنی برائے ترقی کے شعبے میں وظائف دیے جائیں گے جو کلیدی ترقیاتی پالیسیوں کو آگے بڑھانے کی پوزیشن میں ہوں اور ترجیحی شعبوں مثلاً کان کنی میں اداراتی صلاحیت (institutional capacity) کو بڑھا سکیں۔[42]

آسٹریلیا کے سرکاری تجارتی ادارے آسٹریلین ٹریڈ کمیشن نے بھی تعلیم کے حوالے سے پاکستان میں عزائم کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ آسٹریڈ کی پاکستان میں تجارتی پالیسی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ:

''تعلیم و تربیت، بالخصوص منڈی کے مطابق ٹریننگ دے کر تمام ووکیشنل سیکٹرز میں کام کے لیے گریجویٹ تیار کیے جائیں تاکہ تربیت یافتہ اور ہنرمند کارکنوں کی عالمی مانگ پوری کی جاسکے۔ اس میں کئی شعبے شامل ہوں گے جیسے زرعی تجارت، سیاحت اور مہمان نوازی، صحت اور طب، انفراسٹرکچر اور خاص طور پر کان کنی اور توانائی کا شعبہ''۔[43]

آسٹریلیا کے کان کنی کے شعبے میں وظائف دینے کے اعلان اور بطور خاص عہدیداران اور پیشہ ور افراد کو تربیت دینے کے اعلان سے اس کی پاکستان میں زیر زمین معدنیات کے ذخائر میں دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ آسٹریلین ٹریڈ کمیشن یا آسٹریڈ کا کہنا ہے کہ وسائل اور توانائی کے شعبے میں وہ پاکستان کے کثیر قدرتی وسائل کی ترقی کے لیے اپنی مہارتیں فراہم کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ کان کنی میں مہارتوں کے علاوہ آسٹریلیا کان کنی کے شعبے (Mining Equipment & Technical Services/METS) میں بھی اپنی خدمات فراہم کرنا چاہتا ہے۔[44] مثال کے طور پر آسٹریلین کمپنیوں نے آسٹریڈ سے درخواست کی ہے کہ وہ پاکستان میں شیل گیس (Shale gas) کے ذخائر کی تلاش کی اجازت دلوانے میں ان کی مدد کرے کیوں کہ ارضیاتی تحقیق سے اشارے ملے ہیں کہ پاکستان میں شیل گیس کے بڑے ذخائر ہوسکتے ہیں۔ امریکہ کے توانائی پر تحقیق کرنے والے سرکاری ادارے یو ایس انرجی انفارمیشن ایڈمنسٹریشن کی تحقیقی رپورٹ کے مطابق دنیا میں شیل گیس کے قابل حصول ذخائر رکھنے والے دس سب سے بڑے ممالک میں پاکستان بھی شامل ہے۔ پاکستان نو ارب بیرل ذخائر کے ساتھ اس فہرست میں نویں نمبر پر ہے۔[45]

اختتامیہ

آسٹریلین ایڈ کی پاکستان میں امدادی سرگرمیوں کے مختصر جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاکستان میں جہاں جہاں آسٹریلیا کا کاروباری شعبہ اپنی مہارت استعمال کرتے ہوئے منڈی میں حصہ لے سکتا ہے وہاں وہ سرمایہ کاری کے ذریعے منافع کمانے کے مواقع ڈھونڈھ رہا ہے اور اس عمل میں آسٹریلیا اپنی امدادی ایجنسی کے ذریعے ایسے مواقع پیدا کرنے اور انھیں فروغ دینے کی کوشش کررہا ہے تاکہ آسٹریلوی مصنوعات اور خدمات کی پاکستان میں زیادہ سے زیادہ کھپت ہو۔ اسی لیے آسٹریلین ایڈ اپنی دستاویزات میں پیداوار میں اضافے پر زور دیتا ہے، غربت میں کمی پر نہیں۔ پیداوار میں اضافے کے لیے جدید ٹیکنالوجی درکار ہوگی۔ اس مشینری، بیج، خدمات وغیرہ کو خریدنے کی وجہ سے پاکستان کو ڈبلیو ٹی او کے ذہنی ملکیت کے حقوق کے عالمی معاہدے (Trade-related Aspects of Intellectual Property Rights/TRIPS) کے تحت آسٹریلوی کمپنیوں کو رائلٹی بھی دینی پڑے گی جس کی تلافی قیمتوں میں اضافے کی شکل میں صارفین سے کی جائے۔ جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے چھوٹے اور بے زمین کسان اور مزدور بے روزگار ہوجاتے ہیں جس سے ملک میں شدید غربت میں اضافہ تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ساتھ جرائم کی شرح میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

آسٹریلوی حکومت اپنے تجارتی عزائم کی خبر خود اپنے فیصلوں سے دیتی ہے جیسے 31 اکتوبر 2013 کو آسٹریلوی حکومت نے آسٹریلین ایڈ کی علیحدہ شناخت ختم کرتے ہوئے اسے آسٹریلوی وزارت خارجہ و تجارت میں ضم کرنے کا اعلان کردیا تاکہ آسٹریلیا کے ترقیاتی، خارجہ پالیسی اور تجارتی مقاصد کو بہتر طور پر ہم آہنگ کیا جاسکے۔[46] آسٹریلوی حکومت کے اس فیصلے پر آسٹریلیا میں تنقید کی جارہی ہے۔ آسٹریلین ایڈ پر تنقیدی نظر رکھنے والی آسٹریلوی این جی او ''ایڈ واچ'' نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ آسٹریلوی حکومت کے اس فیصلے سے عیاں ہے کہ عالمی غربت کا خاتمہ اب اس کی ترجیح نہیں رہی۔ آسٹریلین ایڈ اس وقت غربت میں کمی اور قومی مفاد کو پروان چڑھانے کے دوہرے مقصد پر کام کررہا ہے۔[47]

آسٹریلیا پاکستان کو امداد کی مد میں جتنا پیسہ دے رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ پیسہ وہ تجارت کے ذریعے واپس اپنے ملک لے جارہا ہے۔ یعنی آسٹریلیا،

پاکستان کو امداد تو دے رہا ہے لیکن ساتھ ساتھ تجارت کو فروغ دیتے ہوئے اپنی مصنوعات اور خدمات کے لیے پاکستان میں برآمدی منڈیاں قائم کررہا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آسٹریلیا، پاکستان میں نیولبرل مارکیٹ اکانومی یعنی آزاد تجارت پر مبنی اصولوں کو کھل کر رائج کررہا ہے۔ اس طرح پاکستان میں بعض افراد کو نیا روزگار تو مل سکتا ہے لیکن ملک کی مجموعی غربت میں کمی نہیں آسکتی۔

حکومت پاکستان اگر ملک سے غربت کا خاتمہ چاہتی ہے تو اسے ایسی پالیسیاں بنانی ہوگی جن سے کسانوں اور مزدوروں کی خودمختاری میں اضافہ ہو نہ کہ غیر ملکی مشینری اور خدمات کی وجہ سے وہ بے روزگاری اور بھوک کا شکار ہوں۔

حوالہ جات

1- Australian Government, AusAid. "About AusAid," accessed on September 14, 2013 from http://www.ausaid.gov.au/about/Pages/default.aspx

2- Australian Government, AusAid. "Annual Report 2011-12," 2012, p.vii, accessed from http://www.ausaid.gov.au/AnnualReports/Documents/rep12/ausaid-annual-report-2011-12.pdf

3- Australian Government, AusAid. "Helping the world's poor through effective aid: Australia's comprehensive aid policy framework to 2015-16," 2012, p. 12, accessed form http://www.ausaid.gov.au/about/documents/capf.pdf

4- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "Pakistan," November 1, 2013, accessed from http://aid.dfat.gov.au/countries/southasia/pakistan/Pages/home.aspx

5- کثیر طرفہ ادارہ ایسا ادارہ ہوتا ہے جس کے رکن کئی ممالک ہوں اوران ممالک کے مشترکہ پیسوں سے اسے چلایا جائے مثلاً اقوام متحدہ، عالمی بینک، ایشیائی ترقیاتی بینک وغیرہ۔

6-Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "How we give aid to Pakistan," November 1, 2013, accessed from http://www.ausaid.gov.au/countries/southasia/pakistan/Pages/how-aid.aspx

7- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "Pakistan," November 1, 2013, accessed from http://aid.dfat.gov.au/countries/southasia/pakistan/Pages/home.aspx

8- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "Pakistan: Agriculture Sector Linkages Program Phase II," November 1, 2013, accessed from http://www.ausaid.gov.au/countries/southasia/pakistan/Pages/sustainable-economic-development-init2.aspx

9- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "Pakistan: Economic development," November 1, 2013, accessed from http://www.ausaid.gov.au/countries/southasia/pakistan/Pages/sustainable-economic-development.aspx

10- Australian Government. "Australia in the Asian century: Pakistan profile," p. 2, accessed from http://www.dfat.gov.au/publications/asian-century/downloads/pakistan.pdf

11- Australian Government, Australian Centre for International Agricultural Research. "Australia–Pakistan Agriculture and Rural Development Strategy 2010-2015," accessed from http://aciar.gov.au/files/node/729/aslp_info_phases_1_and_2_19023.pdf

12- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "Pakistan: see our results," November 1, 2013, accessed from http://aid.dfat.gov.au/countries/southasia/pakistan/Pages/home.aspx

13- Australian Government, AusAid. "Sustainable economic development: transport, water, urban, energy and communications infrastructure," November 2011, p. 3, accessed from http://www.ausaid.gov.au/aidissues/Documents/thematic-strategies/infrastructure-strategy.pdf

14- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "Pakistan: see our results," November 1, 2013, accessed from http://aid.dfat.gov.au/countries/southasia/pakistan/Pages/home.aspx

15- ASLP Dairy Project, Pakistan "Dairy project k maqasid," accessed from http://aslpdairy.pk/ur/index.php

16- ASLP Dairy Project, Pakistan. "Introduction," accessed from http://aslpdairy.pk/en/dpphase1.php

17- ASLP Dairy Project, Pakistan "Sang-e-meel," accessed from http://aslpdairy.pk/ur/milestones2.php

18- Australian High Commission, Pakistan. (2013). "Australia announces USD$13 million Balochistan agricultural project," (Media release). April 15, 2013, accessed from http://www.pakistan.embassy.gov.au/files/islm/130415-MediaRelease-AidBalochistanAgri.pdf

19- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "Pakistan: see our results," November 1, 2013, accessed from http://aid.dfat.gov.au/countries/southasia/pakistan/Pages/home.aspx

20- Australian High Commission, Pakistan. (2013). "Australia celebrates successes of Pakistani scholarship awardees," (Press release). February 26, 2013, accessed from http://www.pakistan.embassy.gov.au/islm/PR130226AustAwards.html

21- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. "Pakistan: see our results," November 1, 2013, accessed from http://aid.dfat.gov.au/countries/southasia/pakistan/Pages/home.aspx

22- Commonwealth of Australia. "Sustainable economic development: improving food security," published by Australian Agency for International Development (AusAid), March 2012, p.2, accessed from http://www.ausaid.gov.au/aidissues/Documents/thematic-strategies/food-security-strategy.pdf

23- Australian Government, AusAid. "Sustainable economic development: transport, water, urban, energy and communications infrastructure," November 2011, p. 3, accessed from http://www.ausaid.gov.au/aidissues/Documents/thematic-strategies/infrastructure-strategy.pdf

24- Ibid; p. 1.

25- Ibid; p. 2.

26- Ibid; p. 3.

27- Ibid; p. 3.

28- Australian High Commission, Pakistan. (2013). "Australia promotes trade, cooperation and development with Pakistan dairy farmers," (Press release). January 30, 2013, accessed from http://www.pakistan.embassy.gov.au/islm/PR130130-dairy.html

29- Oklahoma State University, Department of Animal Science. "Australian Friesian Sahiwal," December 17, 1996, accessed from http://www.ansi.okstate.edu/breeds/cattle/australianfriesiansahiwal/

30- ASLP Pakistan, "Pakistan-Australia Agriculture Sector Linkages Program: program review," p. I, accessed from http://aslpdairy.pk/en/files/ASLP%20Review%20Report.pdf

31- Australian Government, Department of Foreign Affairs and Trade. The Hon Kevin Rudd MP, Former Minister for Foreign Affairs. "Australia strengthens development cooperation with Pakistan," October 28, 2011, accessed from http://www.foreignminister.gov.au/releases/2011/kr_mr_111028b.html

بقیہ حوالہ جات صفحہ نمبر 8 پر دیکھیں

بجٹ 2013-14 میں زرعی خرچوں پر ایک نظر

تحریر: صبیحہ حسن

ہم اس مضمون میں سب سے پہلے ان اصلاحات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جن کے تحت دیگر ممالک کی طرح پاکستان کا بجٹ بھی بن رہا ہے، پھر وفاقی اور صوبائی آمدنی اور خرچوں کے مختصر بیان کے ساتھ زراعت کے لیے رکھی گئی رقم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے گی۔ بجٹ کے مختلف حصوں کے اختتام پر ہر حصے پر تبصرہ اور آخر میں ایک تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔

درمیانی مدت کا بجٹ فریم ورک (Medium Term Budgetary Framework/MTBF)

پاکستان کے بجٹ میں اصلاحات عالمی بینک اور مغربی ممالک کے امدادی اداروں کے ذریعے ہو رہی ہے۔[1] یہ کام 2003 میں مشرف دور میں شروع ہوا۔ 2009 سے وفاقی بجٹ میں یہ اصلاحات شروع ہوئیں اور اب صوبائی حکومتیں بھی انھیں اپنا رہی ہیں۔ بجٹ میں پہلے وزارتوں کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے بجٹ ترجیحات طے کی جاتی تھیں، اب بجٹ اہداف کو سامنے رکھ کر وزارتوں کو کارگزاری دکھانی ہوتی ہے۔ اسے آؤٹ پٹ بیسڈ (Output-based) طریقہ کار کہا جاتا ہے۔[2] وزیرخزانہ اسحاق ڈار نے اپنی بجٹ تقریر میں اقرار کیا کہ ''یہ بجٹ درمیانی مدت کے فریم ورک کا حصہ ہے جو 2013-14 سے 2015-16 تک محیط'' ہے۔[3] انہوں نے بتایا کہ بجٹ میں اس فریم ورک کے بنیادی نکات یہ ہیں:

- خام قومی پیداوار (GDP) کو 2015-16 تک سات فیصد بڑھایا جائے گا۔
- افراط زر کو جسے عام فہم میں مہنگائی سے جوڑا جاتا ہے، درمیانی مدت میں ایک ہندسے (single digit) کے اندر رکھا جائے گا۔
- سرمایہ کاری کو خام قومی پیداوار (Gross Domestic Product/GDP) کے 20 فیصد تک بڑھایا جائے گا۔
- بجٹ خسارے کو خام قومی پیداوار کے چار فیصد تک لایا جائے گا۔
- زرمبادلہ کو 20 بلین ڈالر تک بڑھایا جائے۔

درمیانی مدت کے ان اہداف کے پیش نظر حکومت نے اس مالیاتی بجٹ میں جن نکات پر توجہ رکھی ہے وہ ہیں:

1۔ بجٹ خسارے میں کمی۔
2۔ ٹیکس میں اضافہ۔
3۔ افراط زر کو روکنا۔
4۔ توانائی کے بحران پر قابو پانا۔
5۔ کمزور طبقوں تک پہنچ نہ سکنے والی زرتلافی (untargetted subsidies) کو کم کرنا۔
6۔ تجارتی عدم توازن کو بہتر بنانا۔
7۔ ملازمت کے نئے ذرائع پیدا کرنا۔[4]

وفاقی آمدنی کے ذرائع

کسی بھی ملک کا بجٹ ایک مالیاتی سال کی آمدنی، اس کے ذرائع اور خرچوں کا تخمینہ پیش کرتا ہے۔ پاکستان چونکہ چار صوبوں کا ایک وفاق ہے اس لیے وفاقی حکومت کے علاوہ وفاق کے چاروں صوبوں کا بجٹ بھی الگ الگ پیش کیا جاتا ہے۔ پورے ملک سے حاصل ٹیکس کی رقم[5] وفاقی حکومت کے ذریعے تقسیم کیے جانے والے قابل تقسیم پول (Divisible Pool) یعنی تجوری میں جمع ہوتی ہے۔ ساتویں نیشنل فنانس کمیشن (NFC) ایوارڈ 2010 میں کہا گیا ہے کہ 2010-11 میں اس رقم میں سے صوبوں کا حصہ 50 سے 56 فیصد تک اور 2011-12 میں 57.5 فیصد تک ہوگا۔[6] ہر صوبے کی آبادی کے بعد غربت کی سطح اور دیگر پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پول سے مندرجہ ذیل تناسب سے رقم تقسیم ہوتی ہے:

بلوچستان	خیبر پختونخواہ	پنجاب	سندھ
9.09%	14.62%	51.74%	24.55%

Source: Budget in Brief, Federal Budget 2013-14, p. 19.

اس رقم کے علاوہ گیس اور تیل وغیرہ کی رائلٹی کی رقم بھی صوبوں کو وفاقی حکومت کے ذریعہ براہ راست منتقل ہوتی ہے۔ یہ تمام رقوم صوبائی حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔

بجٹ 2013-14 میں وفاقی حکومت کی آمدنی کا تخمینہ جدول 1 میں دیکھا جاسکتا ہے:

جدول 1

بجٹ 2013-14 میں اندرونی اور بیرونی آمدنی کا تخمینہ

درجہ بندی	ملین روپے
وسائل (a+b)	3,010,454
a۔ اندرونی وسائل	2,434,035
b۔ بیرونی وسائل	576,419

Source: Budget in Brief, p. 8.

وفاقی حکومت کی کل آمدنی کا تخمینہ 3,010.454 ملین روپے ہے۔ اس میں شامل بیرونی وسائل کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

جدول 2

بیرونی ذرائع (بجٹ 14-2013)

درجہ بندی	ملین روپے
1۔ بیرونی قرضے (a to c)	467,437
a۔ منصوبوں کے قرضے (i+ii)	159,165
i۔ وفاقی حکومت	102,289
- وزارتیں اور ڈویژن	37,717
- کارپوریشن اور آزاد ادارے	64,572
ii۔صوبے	56,876
b۔ پروگرام کے لیے قرضے	110,272
c۔ دیگر امداد	198,000
- اسلامی ترقیاتی بینک	49,500
- یورو بونڈز	49,500
- چائنا سیف ڈیپازٹ	99,000
II۔ بلا سود بیرونی امداد	108,982
- منصوبوں کی امداد	27,657
- وفاقی محکمے	6,942
- آزاد ادارے	50
-صوبے	20,664
- ٹوکیو پیکج	1,119
- نجکاری سے حاصل رقم	79,200
- کیری لوگر امداد	1,006
کل (I+II)	576,419

Source: Budget in Brief, Federal Budget 2013-14, p. 15.

جدول2 میں نجکاری سے حاصل رقم کا تخمینہ بھی لگایا گیا ہے۔ 13-2012 کے بجٹ میں اس حوالے سے رقم ظاہر کی گئی تھی لیکن نظرثانی شدہ (revised) بجٹ میں نجکاری سے کوئی رقم حاصل نہیں کی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلی حکومت نے اس ذریعے سے کوئی رقم نہیں حاصل کی (جدول 3)۔

جدول 3

نجکاری سے حاصل رقم (ملین روپے)

2013-14	2012-13	2012-13
(تخمینہ)	(نظرثانی شدہ رقم)	(تخمینہ)
79,200	x	74,400

Source: Budget in Brief, Federal Budgat 2013-14, p. 15.

وفاقی اخراجات

بجٹ 14-2013 کے تخمینے میں سب سے زیادہ خرچہ اندرونی اور بیرونی قرضوں کی سود کی ادائیگی کا ہے۔ اس میں اندرونی قرضوں کی سود کی رقم بیرونی قرضوں کی سود کی رقم سے کہیں زیادہ ہے۔ دوسرے نمبر پر فوج کے خرچے ہیں جس میں فوجی انتظامیہ اور فوجی اداروں کے خرچے الگ کرکے دکھائے گئے ہیں۔ دونوں میں واضح فرق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ تیسرے نمبر پر دو خرچے ہیں جو تقریباً برابر ہیں یعنی بیرونی قرضوں کی قسطوں کی واپسی کی رقم اور وفاق کی طرف سے دی جانے والی گرانٹس۔ چوتھے نمبر پر ہم دو خرچوں کو دیکھ سکتے ہیں یعنی سول انتظامیہ چلانے کی رقم اور زرتلافی کی رقم۔ پانچویں نمبر پر پینشن کے اخراجات آتے ہیں جس میں فوجی پینشن کے اخراجات سول اخراجات سے کہیں زیادہ ہیں۔ (جدول 4)۔

جدول 4

وفاقی اخراجات کا تخمینہ (بجٹ 14-2013)

درجہ بندی	ملین روپے
(i)۔سود کی ادائیگی	1,153,539
- اندرونی سود کی ادائیگی	1,064,524
- بیرونی سود ادائیگی	89,015
(ii)۔پینشن	171,263
- ملٹری	132,728
- سول	38,535
(iii)۔ دفاعی معاملات اور خدمات	627,226
- دفاعی خدمات	625,336
- دفاعی انتظامیہ	1,890
(iv)۔بغیر سود امداد اور براہ راست منتقلی	337,165
- صوبوں کو امداد	51,363
- دیگر امداد	285,802
(v)۔زرتلافی	240,434
(vi)۔سول حکومت چلانے کا خرچہ	274,693
(vii)۔پینشن اور تنخواہ کی اصلاحات	25,000
جاری خرچے (i-vii)	2,829,321
(viii)۔بیرونی قرضوں کی واپسی	366,761
کل جاری خرچے: (اس میں بیرونی قرضوں کی واپسی شامل ہے)	3,196,082

Source: Budget in Brief, Federal Budgat 2013-14, p. 22.

وفاقی جاری اخراجات کے علاوہ 789.355 ملین روپے کے ترقیاتی اخراجات میں مندرجہ ذیل اخراجات آتے ہیں: سرکاری شعبے کا ترقیاتی پروگرام(PSDP) میں وفاقی حکومت کے خرچے، 540,000 ملین روپے،صوبوں کو دی جانے والی ترقیاتی امداد اور گرانٹس (بلا سود امداد 77,540 ملین روپے، دیگر ترقیاتی اخراجات (علاوہ PSDP) 171,815 ملین روپے۔ اس طرح کل وفاقی خرچ کا تخمینہ 3,985.437 ملین روپے ہے۔[7]

یہاں غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جاری اخراجات میں صرف دو خرچوں پر 68 فیصد سے زیادہ خرچ کیا جارہا ہے۔ یعنی قرضوں کی ادائیگی (47.56 فیصد) اور دفاع (20.64 فیصد)۔ اب ہم خرچوں کی تفصیل کو دیکھتے ہیں۔ خرچوں کو دس شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے جنہیں تین حصوں میں دیکھا جاسکتا ہے یعنی انتظامی، پیداواری اور سماجی خرچے (جدول 5)۔

جدول 5

وفاقی خرچوں کی فہرست (بجٹ 14-2013)

درجہ بندی	ملین روپے
انتظامی:	
(1) عمومی عوامی خدمت	2,357,401
(2) دفاعی معاملات اور خدمات	627,226
(3) امن عامہ	78,462
پیداواری:	
(4) معاشی معاملات	52,262
سماجی:	
(5) تحفظ ماحول	924
(6) مکانات کی تعمیر اور بستیوں کی سہولیات	1,912
(7) صحت کے معاملات اور خدمات	9,863
(8) تفریح، ثقافت اور مذہبی امور	6,950
(9) تعلیمی معاملات اور خدمات	59,277
(10) سماجی تحفظ	1,806
کل	3,196,082

Source: Budget in Brief, p. 23.

پہلے تین خرچے انتظامی ہیں اور آخری چھ سماجی، صرف اکنامک افیئرز یا معاشی معاملات کا شعبہ پیداواری ہے اور سب سے کم رقم اسی شعبے کے لیے رکھی گئی ہے۔ معاشی معاملات میں شامل شعبوں کی تفصیل جدول 6 میں بیان کی گئی ہے:

جدول 6

معاشی معاملات (بجٹ 14-2013)

درجہ بندی	ملین روپے
معاشی معاملات	52,262
عمومی معاشی، کاروباری اور مزدوروں کے معاملات	14,940
زراعت، خوراک، آبپاشی، جنگلات اور ماہی گیری	20,430
تیل اور توانائی	642
صنعت اور معدنیات	1,964
تعمیرات اور آمد و رفت	10,050
ابلاغ	2,804
دیگر صنعتیں	1,431

Source: Budget in Brief, p. 27.

مندرجہ بالا جدول سے صاف ظاہر ہے کہ زراعت، خوراک، آبپاشی، جنگلات اور ماہی گیری کے لیے رکھی گئی رقم پیداواری شعبوں میں سب سے زیادہ ہے۔ پاکستان کی آبادی کی اکثریت کا تعلق انھی شعبوں سے جڑا ہوا ہے اور یہ بات ان بنیادی پیداواری شعبوں کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ پاکستان کی خام قومی پیداوار کا 21.4 فیصد زراعت سے آتا ہے اور اس سے پاکستان کی 45 فیصد آبادی منسلک ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ زراعت کا محکمہ آئین میں اٹھارویں ترمیم 2010 کے بعد دیگر محکموں کے ساتھ صوبوں کو منتقل ہوگیا ہے لہٰذا اس کی تفصیل صوبائی بجٹوں کے ذکر میں آئے گی۔ وہاں پر ہم دیکھیں گے کہ زراعت پر کس سمت میں خرچے ہورہے ہیں۔

وفاقی بجٹ میں اکنامک افیئرز یا معاشی معاملات کے علاوہ زرعی خرچوں کو کچھ اور حوالوں سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً

- زرتلافی: وفاقی حکومت نے زرعی زرتلافی کے حوالے سے جو ذمہ داری 14-2013 کے بجٹ میں اپنے ذمے لی ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

جدول 7

زرتلافی رمراعات (بجٹ 14-2013)

درجہ بندی	ملین روپے
حکومت پاکستان کا زرعی ٹیوب ویل میں زرتلافی کا حصہ	x
بلوچستان میں زرعی ٹیوب ویل کے لیے محصول کا فرق	3,000
یوٹیلیٹی اسٹورز کو دی جانے والی زرتلافی:	
رمضان پیکج	2,000
چینی کی فروخت	4,000
پاسکو کو دی جانے والی زرتلافی:	
قیمت میں گندم کی فروخت کے بعد کا فرق	4,000
گندم کا محفوظ ذخیرہ	5,000
دیگر شعبوں کو دی جانے والی زرتلافی:	
فوجی فرٹیلائزر بن قاسم لمیٹڈ	231
فاٹا میں گندم کی فروخت	283
گلگت بلتستان میں گندم کی فروخت	815
گلگت بلتستان میں نمک کی فروخت	5

Source: Budget in Brief, p. 33.

پچھلے بجٹ میں ٹیوب ویل کے استعمال پر 870 ملین روپے کی زرتلافی کی رقم رکھی گئی تھی جو اس بجٹ میں نہیں ہے۔[8]

- قومی تحفظ خوراک اور تحقیق (نیشنل فوڈ سیکورٹی اینڈ ریسرچ) کی ڈویژن: زراعت کے محکمے کی صوبوں کو منتقلی کے بعد وفاقی حکومت کی خوراک کے حوالے سے ذمہ داریاں یہ محکمہ پوری کرتا ہے۔ یہ نیا محکمہ کیا کام کرتا ہے اس کو پاکستان اکنامک سروے 13-2012 یوں بیان کرتا ہے:

> حکومت نے قومی تحفظ خوراک وتحقیق کی وزارت کو خوراک کی پیداوار اور خوراک وزراعت کی تحقیق کو ملکی سطح پر مربوط کرنے کے لیے قائم کیا ہے۔ اس سے خوراک کے ملک گیر مسئلے سے نمٹا جاسکے گا۔[9]

اس ڈویژن کی دو ترجیحات ہیں: (i) قومی سطح پر خوراک کی پیداوار صوبوں کے زرعی اور مال مویشی کے شعبے کی مدد سے بڑھانا۔ (ii) ضروری کھانے کی اشیا کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے مدنظر غریب اور متاثرہ افراد کی مدد کرنا اور (iii) خوراک میں غذائیت کو بڑھانے کے منصوبوں میں دیگر شعبوں سے تعاون بڑھانا۔ اس محکمے کے لیے 750 ملین روپے حکومتی شعبے کے ترقیاتی پروگرام (PSDP) میں رکھے گئے ہیں۔[10]

- دیگر اخراجات: پبلک سیکٹر ترقیاتی پروگرام کے علاوہ بھی 14 مزید خرچوں کا ذکر بجٹ 14-2013 میں ملتا ہے ان میں سے تین کا ذکر یہاں کرکے وفاقی بجٹ کی تفصیل کو ختم کرتے ہیں:

1۔ غربت میں کمی کے لیے بلا سود امداد 5,000 ملین روپے اور قرضے 9.995 ملین روپے۔

2۔ ٹریڈنگ کارپوریشن کو یوریا کی درآمد کے لیے زرتلافی 30,000 ملین روپے۔

3۔ بےنظیر انکم سپورٹ پروگرام (BISP) کے لیے 75,000 ملین روپے۔

Source: Budget in Brief, p. 43.

ان تین خرچوں میں دوسرا خرچہ اس زرعی زرتلافی کا ہے جو مقامی یوریا کمپنیوں کو گیس کی فراہمی کی کمی کی وجہ سے یوریا کی درآمد کے لیے دیا جاتا ہے۔ باقی دو خرچے حفاظتی جال (safety nets) کے ذریعے غربت پر قابو پانے کے حوالے سے ہیں۔

تبصرہ:

وفاقی حکومت کی آمدنی (بیرونی امداد ملا کر) 3,010,454 ملین روپے اور خرچے 3,985,437 ملین روپے کے ہیں۔ بجٹ خسارے کی رقم 974.983 ملین روپے ہے جس کے لیے مزید قرض لے کر معیشت کو چلانا ہے۔ لہذا ایک بڑے کشکول کو اٹھانا اور نجکاری کے ذریعے قومی اثاثے بیچنے کا پورا پروگرام ہے لیکن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مزید قرض سے صرف سود کی رقم اور کچھ قرض کی قسطیں ادا ہوں گی۔ معیشت نہیں چلے گی۔ معیشت جب چلے جب ہمارا پیداواری شعبہ توانا ہوگا۔ لیکن وفاقی بجٹ یہ دکھا رہا ہے کہ پیداواری شعبے کی بحالی پر سب سے کم توجہ ہے کیونکہ خودانحصاری اس عالمی ایجنڈے کے خلاف ہے جس کے تحت ہمارے بجٹ میں اصلاحات کا کام ہو رہا ہے۔ توجہ تعلیم اور غربت مٹانے پر ہے جو بظاہر بہت اچھی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر درپردہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ بیرونی کارپوریٹ شعبے کی ضرورت ہے جو ہماری معیشت پر پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ غریب عوام کے لیے اس جال کا اہتمام کیا گیا ہے جس کا نام ''سیفٹی نیٹس'' ہے تاکہ وہ غربت سے بلبلا کے اس نظام کے خلاف علم بغاوت نہ اٹھائیں جس سے بڑی مچھلیاں ہی فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ہمارے بجٹ میں جس سوچ کے تحت اصلاحات لائی جارہی ہے وہ منڈی معیشت کے لیے راستہ صاف کرنے کی نیولبرل سوچ ہے۔ اس میں قومی حکومتوں کا کردار صرف ایک سہولت کار سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس کی تفصیل ہم صوبائی حکومتوں کے بجٹ جائزے میں بیان کریں گے۔

صوبوں کی آمدنی

چاروں صوبوں کی ٹیکس سے حاصل آمدنی کا الگ الگ تخمینہ مندرجہ ذیل جدول میں دیکھا جاسکتا ہے:

جدول 8
صوبوں کی ٹیکس سے حاصل آمدنی

صوبہ	صوبائی ٹیکس کی آمدنی	وفاق سے حاصل ٹیکس کی آمدنی
بلوچستان	1,550.796*	123,274.182
خیبر پختونخواہ	8,559.263**	198,269.368
پنجاب	126,702.799	702,120.646
سندھ	120,200.000***	332,900.000

(Rs in million)

* Excluding non-tax. **Including non-tax. ***Including GST.

Source: White Papers of Balochistan, Khyber Pukhtunkhwa and the Punjab, pp. 9, i, v, respectively. For Sindh see *Dawn*, 18 June 2013, pp. 1 & 3.

وفاقی ٹیکسوں کی آمدنی ہر صوبے کو ایک خاص تناسب سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر وفاقی ادارہ برائے محصولات (Federal Bureau of Revenue/FBR) تخمینہ سے کم ٹیکس جمع کرے تو صوبوں کا حصہ بھی کم ہوجاتا ہے۔

ٹیکسوں میں کچھ بلاواسطہ (direct) ٹیکس ہوتے ہیں جیسے زرعی ٹیکس، جائیداد (Property) پر ٹیکس، لینڈ ریونیو، پیشہ ور افراد پر ٹیکس اور کیپٹل ویلیو ٹیکس (یا سرمائے کی قدر پر ٹیکس) وغیرہ۔ یہاں پر ہم صرف زرعی انکم ٹیکس کی بات کریں گے۔ جس کو دو حصوں میں دیکھا جاسکتا ہے (i) زرعی زمین پر ٹیکس (ii) زرعی آمدنی پر ٹیکس۔ انکم ٹیکس ایکٹ 1997 کے تحت زرعی زمین پر فی ایکڑ کے حساب سے خاص مقرر رقم ٹیکس کی مد میں دینی ہوتی ہے۔ 2001 میں اس ایکٹ میں ترمیم کی گئی اور وہ افراد جن کے پاس 25 ایکڑ نہری یا 50 ایکڑ بارانی زمین ہو انہیں ٹیکس جمع کرانا ہوتا ہے۔ زمین چونکہ وراثت میں بٹ کے چھوٹی ہوجاتی ہے اس لیے اس طریقے سے کچھ خاص آمدنی حاصل نہیں ہوتی۔ 14-2013 کے بجٹ مسودے میں اس ذریعے سے حاصل رقم کا تخمینہ کچھ یوں ہے: بلوچستان 2,000 ملین روپے، خیبر پختونخواہ 22,000 ملین روپے، پنجاب 2,018.938 ملین روپے۔[11] زرعی ٹیکس کی آمدنی صوبائی ادارہ برائے محصولات اکٹھی کرتا ہے۔ بیوریو جو محصول جمع کرتا ہے ان میں زرعی انکم ٹیکس کے علاوہ رجسٹریشن، لینڈ ریونیو، کیپٹل ویلیو ٹیکس اور اسٹیمپ ڈیوٹی شامل ہیں۔ بیورو آف ریونیو کو دیگر

ذرائع میں سب سے زیادہ آمدنی اسٹیمپ ڈیوٹی سے حاصل ہوتی جو بلا واسطہ ٹیکس ہے۔ زرعی انکم ٹیکس کی رقم کو بڑھانے اور پٹواریوں کے عمل دخل روکنے کے لیے لینڈ ریونیو کے ریکارڈ کو کمپیوٹرائز کرنے کا کام بڑی تیزی سے پنجاب اور صوبہ خیبر پختونخواہ میں ہورہا ہے۔[12] یہ کام بیرونی امداد سے Land Record Management Information System (لینڈ ریکارڈ مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم) کے تحت ہورہا ہے۔

جہاں تک زرعی آمدنی پر ٹیکس کا تعلق ہے تو یہ ابھی کسی صوبے میں نافذ نہیں ہوا۔ البتہ پنجاب کی حکومت نے اگلے سال اسے نافذ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اور وفاقی حکومت نے بھی کہا ہے کہ جو لوگ وفاق کی سطح پر اپنی آمدنی کو زرعی دکھا کر ٹیکس نہیں دیتے انہیں یہ چھوٹ اس وقت ملے گی جب صوبے کی سطح پر انہوں نے اپنا زرعی انکم ٹیکس جمع کرایا ہو۔

بلاواسطہ ٹیکسوں میں سے خدمات (services) پر سیلز ٹیکس عائد کرنے کا حق 2010 سے صوبوں کو دیا گیا ہے۔ 2013-14 کے بجٹ میں ہر صوبے نے اپنے بجٹ خسارے کو کم کرنے کے لیے اس ٹیکس کی آمدنی کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے۔ وفاقی وزیر خزانہ نے جنرل سیلز ٹیکس (General Sales Tax/GST) 16 فیصد سے اب 17 فیصد کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے۔ یوں صوبے کی سطح پر خدمات پر بھی یہ اضافہ نافذ ہوگا۔ بلاواسطہ ٹیکسوں میں ایکسائز ڈیوٹی، اسٹیمپ ڈیوٹی، موٹر وہیکل ٹیکس اور بجلی پر ڈیوٹی شامل ہیں۔

بجٹ میں ٹیکس سے باہر حکومتی آمدنی (non-tax income) بھی ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کے مختلف ذرائع ہیں۔ (i) وہ قرض جو صوبائی حکومت نچلی سطح کی حکومتوں (لوکل، ڈسٹرکٹ)، مختلف اداروں یا سرکاری ملازمین کو دیتی ہے ان پر منافع کی رقم۔ (ii) جب ایک صوبہ دوسرے صوبوں کو پانی فراہم کرتا ہے تو اس پر منافع (Hydel profit) کی رقم بھی وفاق سے براہ راست صوبوں کو منتقل ہوتی ہے۔ (iii) وہ خدمات اور امور جو انتظامیہ انجام دیتی ہے۔ (iv) وہ خصوصی معاشی خدمت جو حکومت کے متفرق محکمے (انڈسٹری سے لے کر آبپاشی، ماہی گیری، زراعت اور دیگر) انجام دیتے ہیں مثلاً زراعت کے حوالے سے زرعی مشینری وغیرہ کے کرائے کی رقم سب ٹیکس سے باہر (non-tax) حکومتی آمدنی میں شمار ہوتی ہے۔ صوبوں کی زرعی شعبے سے حاصل آمدنی اس حوالے سے کچھ یوں ہے: بلوچستان، 323.245 ملین روپے، صوبہ خیبر پختونخواہ، 131,300 روپے، پنجاب، 755,909 ملین روپے۔[13]

ڈسٹرکٹ، لوکل گورنمنٹ یا اداروں اور ایجنسیوں اور سرکاری ملازمین کو جو قرض حکومت دیتی ہے اس کی واپسی کی رقم سرمائے کی رسید (Capital Receipt) میں ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی امداد جو کسی خاص ترقیاتی منصوبے کے لیے ہو یا ترقیاتی گرانٹس، وفاقی حکومت کے ذریعے صوبوں کو ملتی ہے۔ ان تمام ذرائع کو اگر جمع کرلیں تو صوبوں کی کل آمدنی مندرجہ ذیل ہے:[14]

صوبہ بلوچستان	190,453.373 ملین روپے
صوبہ خیبر پختونخواہ	344,000.000 ملین روپے
صوبہ پنجاب	949,314.576 ملین روپے
صوبہ سندھ	520,200.000 ملین روپے

تبصرہ:

پاکستان ایک وفاقی ملک ہے لیکن اس کی وفاقی اکائیاں کتنی خودمختار ہیں اس کا اندازہ آپ ان کی آمدنی کی اعداد و شمار سے لگا سکتے ہیں۔ وفاقی حکومت خود کن ہاتھوں میں کھیل کر اپنی خودمختاری کھوچکی ہے اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان بے اختیار صوبائی حکومتوں میں سب سے زیادہ کمزدور بلوچستان کی حکومت ہے۔ رقبے کے حساب سے سب سے بڑے صوبے کو وفاق سے کچھ بھی نہیں ملا اسی لیے صوبے کے عوام پہاڑوں پر ٹھکانے بنا کر مزاحمت کررہے ہیں۔ جب عوام بڑی سطح پر ہونے والی ناانصافی کو نہیں دیکھ پاتے تو علاقائی سطح پر یوں ہی اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کے تمام پسے ہوئے طبقے اپنی محرومی کے بڑے کینوس (canvas) کو اچھی طرح سمجھیں اور اس کے خلاف مزاحمت کے لیے ایک دوسرے کے دست و بازو بنیں۔ حکومت کی توجہ زرعی انکم ٹیکس پر ہے، زمین کی منصفانہ تقسیم پر کیوں نہیں؟ اس بات کو سمجھ کر سب زمین کی منصفانہ تقسیم کا مطالبہ کریں اور زمین ہتھیانے کے خلاف آواز بلند کریں۔ مہنگائی میں اضافہ کیوں ہے؟ اس کو سمجھ کر خدمات پر سیلز ٹیکس اور سب سے بڑھ کر اس حکومت کی نجکاری کی پالیسی کے خلاف سب مل کر کھڑے ہوں۔ یہ وہ ناانصافیاں ہیں جن کے خلاف ہمیں متحرک ہونا ہے۔

صوبائی خرچوں کا تخمینہ

صوبائی خرچوں کا تقابلی جائزہ مندرجہ ذیل جدول میں پیش کیا گیا ہے:

جدول 9

چاروں صوبوں کے بجٹ اخراجات 2013-14 کا تخمینہ

صوبہ	کل خرچہ (ملین روپے)
بلوچستان	198,495.296
خیبر پختونخواہ	329,000.000
پنجاب	897,569.311
سندھ	540,900,000

Source: White Paper of Balochistan, Khyber Pakhtunkhwa and the Punjab, pp. 31, iv, iv respectivly. For Sindh see http://www.app.com.pk/en,6september,2013

مضمون کے اس حصے میں ہر صوبے کے خرچوں کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ ہر صوبے کی الگ الگ تجزیے کے بعد ایک مجموعی خاکہ سامنے آسکے۔

صوبہ بلوچستان:

بلوچستان کے بجٹ کے وائٹ پیپر 14-2013 میں خرچوں کا کل تخمینہ 198,492.296 ملین روپے لگایا گیا ہے۔ اس میں جاری اخراجات (current expenditure) کا تخمینہ 117,348.252 ملین روپے اور ترقیاتی اخراجات 43,912.875 ملین روپے کے ہیں۔ کل تخمینہ میں بیرونی امداد سے چلنے والے منصوبوں کا تخمینہ 3,981.244 ملین روپے ہے اور صوبائی حکومتی شعبے کے ترقیاتی پروگرام (PSDP) کے 39,931.631 ملین روپے بھی شامل ہیں۔ کل تخمینہ میں موجود جاری (current) اخراجات میں پہلا خرچہ سماجی خدمات ہے جس پر سب سے زیادہ خرچہ دکھایا گیا ہے اس میں بنیادی طور سے تعلیم اور صحت کے شعبے آتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے نمبر پر انتظامی امور اور امن عامہ (law & order) پر خرچے بالترتیب اس کے بعد ہیں۔ چوتھے نمبر پر معاشی خدمات (economic services) یا پیداواری شعبہ آتا ہے جس کے لیے 25,860,495 ملین روپے کی رقم مختص ہے اور آخر میں پھر کمیونٹی سروسز اور قرض کی واپسی کی رقم آتی ہے۔

خیال رہے جاری اخراجات میں معاشی خدمات یا پیداواری شعبہ میں سب سے زیادہ اخراجات دیہی ترقی، توانائی اور زراعت، مال مویشی اور آبپاشی کے لیے مختص ہیں۔خوراک کے لیے بھی ایک خاص رقم الگ سے رکھی گئی ہے (جدول 10)۔

جدول 10

پیداواری شعبے کے اخراجات (بجٹ 14-2013)

معاشی خدمات	مختص رقوم (ملین روپے)
خوراک	331.908
زراعت	5,580.994
زمین سے حاصل آمدنی	152.635
مویشی بانی	2,151.998
جنگلات	614.891
ماہی گیری	526.771
کارپوریشن	92.093
آبپاشی	1,864.430
دیہی ترقی	6,852.029
صنعت	912.699
اسٹیشنری اور پرنٹنگ	93.189
معدنیاتی وسائل (سائنسی محکمہ)	543.561
ذرائع آمد و رفت کا محکمہ	45.840
ترقی نسواں کا محکمہ	61.373
توانائی کا محکمہ	5,488.645
انفارمیشن ٹیکنالوجی کا محکمہ	378.207
ماحولیات کا محکمہ	169.224
کل	25,860.487

Source: White Paper, Government of Balochistan, p. 37.

اوپر دیئے گئے خرچوں میں آبپاشی کے نیٹ ورک کی دیکھ بھال، مرمت اور بنیادی ڈھانچے کے فروغ اور بہتری، کسانوں کے لیے ''تحقیق، توسیع (Research & Extension) کے کام اور دیہی ترقی بھی شامل ہے۔

ترقیاتی اخراجات:

بجٹ وائٹ پیپر میں 2004 سے ترقیاتی اخراجات کے تجزیے میں سماجی، پیداواری اور بنیادی ڈھانچے (جس میں آبپاشی کو بھی شامل کیا گیا ہے) کے شعبوں کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں پیداواری شعبہ تیسرے نمبر پر ہے جس پر صرف سات فیصد خرچ ہورہا ہے اور وائٹ پیپر کے مطابق ثابت کرتا ہے کہ ''بلوچستان کی معیشت کو سہارا دینے کے لیے کوئی خاص کاوش نہیں کی گئی ہے''۔[15] (فیگر نمبر1)

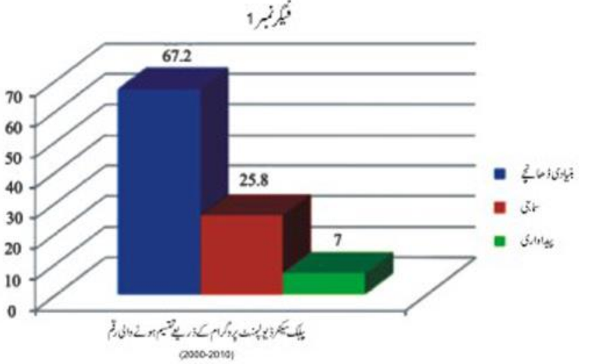

بلوچستان کی حکومت نے 14-2013 کے ترقیاتی پروگراموں میں ان ترقیاتی اسکیموں پر کام کرنے کا ارادہ کیا ہے جو ''شواہد پر مبنی'' (evidence-based) ہوں، ملینیم ترقیاتی اہداف (Millennium Development Goals/MDGs) اور پلاننگ کمیشن کے ''زمینی تجزیوں'' (situation analysis) کے مطابق ہوں۔ اس حوالے سے تعلیم، صحت اور زراعت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ حکومت نے یہ ارادہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اضلاع کے درمیان بنیادی ڈھانچے کی فراہمی کے فرق کو کم کیا جائے گا اور جاری منصوبوں پر 70 فیصد اور نئے منصوبوں پر 30 فیصد ترقیاتی بجٹ استعمال ہوگا۔ یہ رقوم صرف حکومتی اداروں کو دی جائیں گی اور ان منصوبوں کو دی جائیں گی جو انفرادی نوعیت کے بجائے اجتماعی نوعیت کی ہوں۔ اس ویژن کے ساتھ ترقیاتی بجٹ میں زراعت اور اس سے جڑے شعبوں پر نظر دوڑائیں تو جاری منصوبوں میں زراعت سے متعلق کوئی منصوبہ نہیں ملتا لیکن آبپاشی کے چھوٹے بڑے کئی منصوبے نظر آتے ہیں۔[16]

آئندہ کے ترقیاتی کاموں کی اسکیموں کی لمبی فہرست میں 89 منصوبے شامل ہیں[17]۔ پانی کے منصوبوں کے علاوہ زراعت کے حوالے سے پانچ منصوبے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ جدید تحقیق کے ذریعے فصلوں کی پیداوار میں اضافہ۔
2۔ بیج کی پیداوار میں اضافے کا پروگرام۔
3۔ کپاس کی کاشت کاری کا فروغ۔

4۔ پیداوار میں بہتری لاکر باغبانی کی ترقی (Horticultural Development) کی رفتار بڑھانا۔

5۔ زرعی کالج کوئٹہ کو ترقی دے کر زرعی یونیورسٹی بلوچستان بنانا۔

تبصرہ:

بلوچستان کے خرچوں پر نظر دوڑانے سے بنیادی طور سے دو باتیں سامنے آتی ہیں جو وفاقی بجٹ میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں یعنی صوبے کا پیداواری شعبہ بہت زیادہ نظر انداز ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ پیداواری اخراجات میں زراعت، مال مویشی اور خوراک کی اہمیت بہرحال اپنی جگہ موجود ہے لیکن ان شعبوں میں ترقی کس سمت میں ہورہی ہے، اس کی وضاحت سالانہ ترقیاتی پلان کی زبان خود کررہی ہے۔ یعنی صوبے کا ترقیاتی پلان بجٹ اصلاحات اور ملینیم ترقیاتی اہداف کی ترجیحات کے تحت بنایا گیا ہے جنھیں اپنانے کا مطلب حکومتی کردار کو کم کر کے منڈی کے کردار کو بڑھانا ہے۔

صوبہ خیبر پختونخواہ:

اس صوبے نے اپنے اخراجات کو تین حصوں میں پیش کیا ہے: فلاحی، انتظامی اور ترقیاتی۔ ان کا تخمینہ یوں ہے:

جدول 11

بجٹ تخمینہ :صوبہ پختونخوا (بجٹ 13-2012)

شمارنمبر	تفصیل	ملین روپے
1	فلاحی بجٹ	162,969.040
2	انتظامی بجٹ	63,030.960
3	ترقیاتی بجٹ	118,000.000
	کل	344,000.000

Source: White Paper, pp. 13-14, Government of Khyber Pakhtunkhwa, p. 12.

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ فلاحی بجٹ پر 47.3 فیصد، انتظامی بجٹ پر 18.3 فیصد اور ترقیاتی کاموں پر 34 فیصد اخراجات کا تخمینہ ہے۔ ''فلاحی'' اخراجات میں سب سے زیادہ خرچہ بنیادی اور ثانوی تعلیم پر ہے جو تقریباً انتظامی خرچ کے برابر ہے، صحت دوسرے نمبر پر ہے۔ اس کے علاوہ فلاحی بجٹ میں آبپاشی، زراعت اور زرتلافی کے خرچے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قریب قریب ہیں: زرتلافی، 2,500,000 ملین روپے، آبپاشی، 3,122,158 ملین روپے، زراعت: 2,913,869 ملین روپے۔ بجٹ وائٹ پیپر میں آبپاشی کے منصوبوں اور گندم پر زرتلافی کا تفصیل سے ذکر آتا ہے جبکہ زراعت کے حوالے سے کوئی تفصیل نہیں۔ اس کی کچھ تفصیل ترقیاتی بجٹ میں موجود ہے جسے ہم وہیں دیکھیں گے۔ آبپاشی کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ صوبے کے مختلف علاقوں میں کئی ہزار ایکڑ زمین زیر کاشت لائے جانے کا منصوبہ ہے۔[18] اس زمین پر کیسی کاشت ہوگی اس کا اندازہ بھی ہم ترقیاتی بجٹ کی تفصیل میں ہی کر پائیں گے۔ جہاں تک زرتلافی کا سوال ہے تو وائٹ پیپر میں گندم پر زرتلافی کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے کہ خوراک، زراعت اور مال مویشی کا محکمہ (MINFAL) گندم اور دیگر غذائی اشیا کی صوبائی ضروریات پوری کرنے اور تقسیم کرنے کا کام کرتا ہے۔ صوبے کی سال بھر کی کل گندم کی ضروریات 4,189.922 میٹرک ٹن ہے۔ صوبے کی اپنی پیداوار 999,315 میٹرک ٹن ہے۔ اس طرح ہر سال تقریباً 3,190,607 میٹرک ٹن گندم کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ سالانہ گندم کی ضروریات کا تخمینہ ہر سال اپریل کے مہینے میں نیشنل فوڈ سیکورٹی اور ریسرچ کی وزارت کو اسلام آباد میں پیش کیا جاتا ہے۔ پھر پاسکو (PASSCO) کے ذریعے حکومت پنجاب سے اور ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان (Trading Corporation of Pakistan/TCP) کے ذریعے کراچی سے برآمدی گندم صوبہ خیبر پختونخواہ لاکر مقررہ قیمت پر گندم ملوں کو فراہم کیا جاتا ہے تاکہ عام لوگوں تک سستا آٹا پہنچ سکے۔ اس کام کے لیے بجٹ 14-2013 میں 2.500 بلین روپے رکھے گئے ہیں۔[19] خوراک اگر صوبے کا بڑا مسئلہ ہے تو خوراک کی خودمختاری پر حکومت کی توجہ کیوں نہیں ہے؟ توجہ کس طرف ہے، اسے سالانہ ترقیاتی پلان واضح کرتا ہے۔

سالانہ ترقیاتی پلان:

صوبہ پختونخوا کے سالانہ ترقیاتی پلان کے مقاصد (Mission Statement) تقریباً وہی ہیں جو کہ درمیانی مدت کی اصلاحات کے تحت وفاقی حکومت کے ہیں یعنی:

- اگلے تین سالوں میں سات فیصد ترقی کی شرح حاصل کرنا۔
- مختصر (lean) اور مستعد (efficient) حکومتی شعبہ جو مندرجہ ذیل باتوں کو یقینی بنائے گا:

  صوبے میں معیاری خدمات فراہم کرنا کاروبار کے لیے دوستانہ ماحول کے لیے ضابطہ کاری اور کاروبار کرنے کی لاگت میں خاطر خواہ کمی۔ اس کا مقصد بین الاقوامی منڈی میں مقابلے کی صلاحیت رکھنے والی کمپنیاں اور ان کے لیے منڈی پیدا کرنا ہے۔

- ملینیم ترقیاتی اہداف کو 2015 تک پورا کیا جائے گا، شواہد پر مبنی (evidence-based) تیز تر (accelerated) منصوبوں کے ذریعے۔
- غربت کو اگلے تین سالوں میں آدھا کیا جائے گا، بہتر طریقے سے سوچی سمجھی نشانے پر بیٹھنے والی مداخلت کے ذریعے (through well designed targeted interventions)۔
- ایک صحت مند، تعلیم یافتہ اور روادار (tolerant) معاشرہ اور ایک کارآمد محنت کش قوت پیدا کی جائے گی۔

ملینیم ترقیاتی اہداف کیا ہیں؟

پاکستان سمیت دنیا کے 189 ممالک نے 2000 میں ترقی کے جن آٹھ مقاصد کو 2015 تک حاصل کرنے کا عہد کیا تھا وہ یہ ہیں: (i) غربت میں کمی، (ii) سو فیصد پرائمری تعلیم کا ہدف، (iii) بنیادی تعلیم میں صنفی برابری، (iv) بچوں کی شرح اموات میں کمی، (v) دوران حمل عورتوں کی شرح اموات میں کمی، (vi) ایچ آئی وی/ایڈز اور دیگر بیماریوں میں کمی، (vii) ماحول کی پائیداری، (viii) ترقی کے لیے عالمی شراکت داری میں اضافہ۔ پاکستان ان مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔

ملینیم ترقیاتی اہداف کے حوالے سے 2011 کی صوبہ خیبر پختونخواہ کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ صوبے کے وسائل کی محدود بنیاد اور قدرتی اور انسانی پیدا کردہ مسائل کی وجہ سے انھیں حاصل نہیں کیا جاسکتا۔[20]

سالانہ ترقیاتی پلان 14-2013 کے لیے بجٹ میں 83,000.000 ملین روپے رکھے گئے ہیں جو کہ پچھلے سال کے مقابلے میں 12 فیصد زیادہ ہیں۔ اس پلان میں بیرونی امداد کی رقم 35,000.000 ملین روپے ہے۔[21] یعنی ترقیاتی پلان میں 70 فیصد رقم صوبائی بجٹ سے فراہم کی جائے گی اور 30 فیصد بیرونی امداد کے ذریعے جس میں 88 فیصد گرانٹ اور 12 فیصد قرضہ ہے۔[22] ''یہ پروگرام منصوبہ بندی و ترقیات اور مالیاتی محکموں، وزیراعلیٰ کے مشیر برائے منصوبہ بندی و ترقی اور وزیر اعلیٰ کی مشاورت سے بنایا گیا ہے''۔[23] اس میں 983 منصوبے ہیں، 609 جاری منصوبے اور 374 نئے ہیں۔ مختلف شعبوں کے لیے مختص رقم میں سب سے زیادہ علاقائی ترقی (14759.621 ملین روپے) اور سڑکوں کی تعمیر (10258.329 ملین روپے) کے لیے ہے۔ اس کے بعد صحت (7998.077 ملین روپے)، اعلیٰ تعلیم (5722.546 ملین روپے)، شہری ترقی (5692.092 ملین روپے) مالیات (3886.293 ملین روپے)، پانی (3138.293 ملین روپے)، اضلاع کی ترقی (1672,330 ملین روپے)، زراعت (1532,204 ملین روپے) امداد و بحالی (1447.435 ملین روپے) اور توانائی اور بجلی (1414.881 ملین روپے) کی بالترتیب اہمیت نظر آتی ہے۔[24]

زراعت کے حوالے سے سالانہ ترقیاتی پلان کا ویژن مندرجہ ذیل ہے:

> 21 ویں صدی کی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے صوبے کے زرعی شعبے کو ترقی یافتہ اور جاندار بنانا جو ویلیو ایڈیشن یعنی زیادہ مہنگے داموں بکنے والی اشیاء کو فروغ دے اور بین الاقوامی منڈی تک زرعی پیداوار کی رسائی ممکن بنائے۔[25]

اس حوالے سے پالیسی ''تبدیلی'' کا یوں ذکر ہوا ہے:

- روایتی کھیتی باڑی سے زیادہ پیداوار دینے والے (high yield) اور زیادہ قدر (high value) رکھنے والی فصلوں، پھل اور سبزیوں کی طرف تبدیلی۔
- ''غیر پائیدار'' زرعی طریقوں کے ماحولیاتی خطروں کو کم سے کم کرنا۔
- زرعی مارکیٹنگ کے نظام کی اصلاح پر کام کرنا تا کہ کسانوں کو بہتر آمدنی اور لوگوں کو سستی اشیا مل سکیں۔
- زرعی تحقیق اور توسیع (extension) کے نظام میں اصلاحات لانا ''تا کہ نجی شعبہ اس میں حصہ لے سکے''۔[26]

صوبہ خیبر پختونخواہ کی 80 فیصد آبادی بالواسطہ اور 70 فیصد آبادی براہ راست زراعت سے وابستہ ہے۔ سالانہ پلان کے مطابق بہتر دیکھ بھال اور ''سرپرستی کے ذریعے زراعت کو آسانی سے بڑی صنعت کا درجہ دیا جاسکتا ہے''۔[27] صوبہ اپنی خوراک کی ضرورت کو صرف 40 فیصد تک پورا کرسکتا ہے۔ اسی لیے ''غذائی تحفظ'' صوبائی حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اسی وجہ سے سالانہ ترقیاتی پلان کی توجہ غذائی پیداوار بڑھانے پر ہے۔ زراعت کے 35 جاری اور 16 نئے منصوبوں میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ:

1۔ 300 ٹن ہائی برڈ بیج پیدا کیے جائیں گے۔
2۔ 4,500 میٹرک ٹن گندم کے بیج کسانوں کو پیداوار بڑھانے کے لیے دیے جائیں گے۔
3۔ 1,800 ایکڑ زمین پر پھلوں کے باغات لگیں گے۔
4۔ 50,000 پھلوں کے پودے تقسیم کیے جائیں گے۔
5۔ 100,000 زیتون کے پودے لگائے جائیں گے۔
6۔ 110 شمسی پمپ (pumps) اور دیگر جدید طریقوں کے پمپ نصب کیے جائیں گے۔
7۔ 25 بلڈوزر خریدے جائیں گے۔
8۔ 200 پانی کے نئے راستے (courses) بنائے جائیں گے۔

غذائی تحفظ کے لیے محفوظ اور صحت مند خوراک پر زور دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے چھ جاری اور دو آئندہ کی اسکیموں پر 500.233 ملین روپے خرچ ہوں گے۔ صوبے کے مختلف اضلاع میں خوراک کے گودام کے ڈیزائن کی فیزیبلیٹی (feasibility) اور اس کی تفصیل پر کام ہوگا۔ جو گودام پہلے سے صوبے میں کام کررہے ہیں ان میں وزن کرنے کے کانٹے لگائے جائیں گے اور انہیں سامان اٹھانے والی مشینیں (fork lift) فراہم کی جائیں گی۔[28]

تبصرہ:

صوبہ خیبر پختونخواہ کے ''فلاحی'' بجٹ اخراجات میں بہت سے اچھے عوام دوست پہلو نظر آتے ہیں۔ مگر ہم جب سالانہ ترقیاتی پلان تک پہنچتے ہیں تو سارا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ یہ بجٹ دوسرے صوبوں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر نیو لبرل سوچ کی عکاسی کرتا

ہے۔ صوبے کے 70 فیصد عوام کا براہ راست اور 80 فیصد کا بالواسطہ زراعت سے تعلق ہے۔ زراعت کے ذریعے عوامی تحفظ ہی کو اس بجٹ کی بنیاد بنا چاہیے تھا لیکن اندھی تقلید میں لگ جانے سے بجٹ کے اچھے پہلو بھی دب گئے ہیں۔ آپ ایک طرف روایتی کھیتی باڑی سے ہٹا کر صوبے کو صنعتی زراعت کی طرف لے جارہے ہیں تاکہ زیادہ پیداوار حاصل ہوسکے، دوسری طرف ''غیر پائیدار'' زرعی طریقوں سے لاحق ماحولیاتی خطرات کو کم کرنے کی بات بھی ہو رہی ہے۔ صنعتی زراعت تو خود غیر پائیدار ہے، حکومت صاف ستھری زراعت کا تحفظ کرتے ہوئے کسانوں کو تحفظ دینے کی بات کیوں نہیں کرتی؟ 80 فیصد آبادی کو غذائی تحفظ زیادہ پیداوار سے حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے پوری ایک سوچ چاہیے جو زندگیوں کو استحکام دے سکے۔ کیا ہماری حکومتوں کے پاس اتنی فرصت اور جرات ہے کہ وہ ایسے بڑے فیصلے کرسکیں؟

صوبہ پنجاب:

پنجاب کے مالیاتی سال 14-2013 کے اخراجات کا تخمینہ 897,569.311 ملین روپے ہے جس میں 290,000,000 ملین روپے کے ترقیاتی اخراجات ہیں۔ اخراجات کی تفصیل کو مندرجہ ذیل جدول میں دیکھا جاسکتا ہے:

جدول 12

پنجاب کے جاری اور ترقیاتی اخراجات (بجٹ 14-2013)

درجہ بندی	ملین روپے
a۔ جاری اخراجات	607,569.311
انتظامی امور:	
عمومی عوامی خدمات (اس میں لوکل گورنمنٹ شامل ہے)	345,327.434
امن عامہ	93,718.858
پیداواری امور:	
معاشی معاملات	75,652.940
سماجی امور:	
ماحولیات کا تحفظ	116.730
رہائشی اور دیگر سہولیات	4,002.789
صحت	44,629.627
تفریح، ثقافت اور مذہبی امور	1,478.413
تعلیمی معاملات اور خدمات	40,596.539
سماجی تحفظ	2,189.615
b۔ ترقیاتی کام	290,000.000
اے ڈی پی آپریشنل کمی کے ساتھ	240,000.000
اے ڈی پی کی امدادی مد	50,000.000
کل اخراجات (a+b)	897,569.311

Source: White Paper, Budget 2013-14, Government of Punjab, p. 4.

جدول13 سے پتہ چلتا ہے کہ انتظامی امور کے بعد پیداواری امور پر خرچوں کا تخمینہ سب سے زیادہ ہے۔ سماجی نوعیت کے امور اس کے بعد آتے ہیں جس میں صحت اور تعلیم پر خرچے سب سے زیادہ ہیں۔ یہاں اس نقطے کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ بجٹ ترجیحات میں کم سے کم پنجاب میں پیداواری شعبے کی اہمیت نظر آتی ہے۔ جس کی وفاقی بجٹ سمیت ہر صوبے میں اہمیت سب سے کم ہے۔

جب پیداواری امور پر خرچوں کو الگ سے دیکھتے ہیں تو خوراک، زراعت اور آبپاشی کے شعبوں پر بالترتیب 47.82، 17.22، 12.63 فیصد خرچ نظر آتا ہے۔ پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا خوراک پیدا کرنے والا صوبہ ہے۔ پنجاب کے وزیر خزانہ نے خوراک کے حوالے سے زرتلافی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی بجٹ تقریر میں بتایا تھا کہ زرتلافی کی کل رقم 36 بلین روپے ہے۔ اس میں گندم کی امدادی قیمت کے لیے 28 بلین روپے، آمد و رفت اور رمضان پیکیج کے لیے پانچ بلین اور تین بلین روپے رکھے گئے ہیں۔[29] صنعتی ترقی پر 7.67 فیصد رقم مختص ہے جو پیداواری اخراجات کی ترتیب میں چوتھے نمبر ہے۔ مندرجہ ذیل جدول13 ملاحظہ ہو:

جدول 13

معاشی معاملات پر خرچے (بجٹ 14-2013)

نام	فیصد
خوراک	47.82
زراعت	17.20
آبپاشی	12.63
صنعت	7.67
آمد و رفت	4.60
تعمیرات	4.49
جنگلات	3.45
ماہی گیری	0.62
کان کنی	0.60
زمین کی بحالی	0.33
عمومی معاشی معاملات	0.31
مزدوروں کے مجموعی معاملات	0.19
تیل اور توانائی	0.05
کمرشیل معاملات	0.02
سیاحت	0.02

Source: White Paper, Budget 2013-14, Government of Punjab, p. 36.

ترقیاتی اخراجات:

پنجاب کے ترقیاتی بجٹ 14-2013 کا تخمینہ 290 بلین روپے ہے جس میں بنیادی پروگرام 200 بلین کا ہے۔ اسے حکومتی آمدنی اور اخراجات سے بچی رقم (230.30 بلین روپے) اور بیرونی امداد سے حاصل رقم (29.60 بلین روپے) سے پورا کیا جائے

گا۔[30] سالانہ ترقیاتی پروگرام 14-2013، درمیانی مدت کے ترقیاتی فریم ورک (Medium Term Development Framework/MTDF) کے تین سالہ اصلاحاتی رولنگ پلان کا حصہ ہے۔[31] اس کے ترقیاتی مقاصد میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

(i) تمام طبقوں، شعبوں اور علاقوں کی ترقی میں برابری کی بنیاد پر اضافہ۔

(ii) سماجی تحفظ کا پھیلاؤ۔

(iii) روزگار کے مواقع کی فراہمی۔

(iv) پیداواری شعبے میں پیداوار اور مقابلے کی فضا (competitiveness) کو بڑھانا۔

(v) بنیادی ڈھانچے (infrastructure) کی ترقی، بحالی اور مضبوطی۔

(vi) نجی و سرکاری بنیاد پر شراکت داری کا فروغ۔

(vii) کم ترقی یافتہ علاقوں پر توجہ۔

مندرجہ بالا ویژن کے ساتھ 14-2013 کے بجٹ میں بنیادی ڈھانچے کے لیے مختص رقم 92,600 ملین روپے ہے۔[32] سب سے زیادہ تین شعبوں پر خرچ کا پلان ہے: سڑکوں کی تعمیر (33,100 ملین روپے)، آبپاشی (23,500 ملین روپے) اور توانائی (20,500 ملین روپے)۔ ان کے بعد سماجی شعبوں میں تعلیم (25,398 ملین روپے) اور صحت (18.323 ملین روپے) کے لیے سب سے زیادہ رقم رکھی گئی ہے۔[33]

ترقیاتی بجٹ میں پیداواری شعبے کے لیے 14.225 ملین روپے رکھے گئے ہیں۔ ان میں صنعت سب سے پہلا اہم شعبہ ہے، دوسرے نمبر پر زراعت، تیسرے نمبر پر مال مویشی اور چوتھے نمبر پر خوراک ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان منصوبوں پر آئیں جن کا زراعت سے تعلق ہے ہمیں یہاں دو چیزوں کی تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے یعنی:

(i) ترقیاتی پروگرام میں کم ترقی یافتہ علاقوں کے لیے کیا ہو رہا ہے؟ اور

(ii) ترقیاتی کاموں میں نجی اور سرکاری بنیاد پر شراکت داری (پبلک پرائیوٹ پارٹنر شپ) کو کیسے فروغ دیا جا رہا ہے؟

(i) پنجاب میں مختلف علاقوں کی ترقی کی سطح میں بہت فرق ہے۔ اسے کم کرنے کے لیے حکومت پنجاب، جنوبی پنجاب، چولستان اور بارانی علاقوں کی ترقی کی طرف خاص توجہ دے رہی ہے جس کا محور روزگار کی فراہمی سے غربت میں کمی لانا ہے۔ اس حوالے سے مختلف منصوبوں پر کام جاری ہے مثلاً جنوبی پنجاب ترقیاتی پروگرام 2009 میں شروع کیا گیا اور 13-2012 تک یہ 87 فیصد مکمل ہو چکا ہے۔ اس میں سڑکوں کی تعمیر، صحت، پانی کی فراہمی، صفائی، ٹیکنیکل تعلیم اور آبپاشی کے 123 منصوبے شامل ہیں۔ ایک اور منصوبہ پنجاب میں معاشی مواقع پیدا کرنے کا پروگرام (Punjab Economic Opportunities Program/PEOP) ہے جسے برطانیہ کے محکمہ برائے بین الاقوامی ترقی (United Kingdom's Department for International Development/DFID) نے بہاول نگر، بہاولپور، لودھراں اور مظفر گڑھ کے علاقوں میں 2010 میں شروع کیا۔ اس میں کئی ہزار لڑکے اور لڑکیوں کو تربیت کاری کے ذریعے مختلف ہنر سکھائے گئے۔ اس کام میں ٹیکنیکل ٹریننگ کے اداروں اور این جی اوز نے بھی حصہ لیا۔ 16-2015 تک 135,000 لوگوں کو ٹریننگ دینے کا پروگرام ہے۔[34] اس ماڈل کو پنجاب کے دوسرے علاقوں میں بھی فروغ دیا جائے گا۔ غربت کم کرنے کا ایک اور پروجیکٹ (South Punjab Poverty Alleviation Project) بہاول نگر، بہاولپور، مظفر گڑھ اور راجن پور میں بین الاقوامی فنڈ برائے زرعی ترقی (International Fund for Agricultural Development/IFAD) کی مدد سے چل رہا ہے۔ 4.1 بلین روپے کے اس منصوبے میں اثاثہ پیدا (asset creation) کرنے، مہارت حاصل کرنے، مقامی آبادی کے لیے منصوبوں، زراعت اور مال مویشی کی پیداوار میں اضافے سے 80,000 غریب ترین خاندانوں کی مدد کی جائے گی۔[35]

(ii) 2009 میں بنیادی ڈھانچے کی ترقی کے لیے پبلک پرائیوٹ پارٹنر شپ کی پالیسی شروع کی گئی۔ اس کا مقصد حکومتی شعبے کے ترقیاتی کاموں میں نجی شعبے کی سرمایہ کاری کا فروغ ہے۔ پنجاب کی صوبائی اسمبلی نے پبلک پرائیوٹ پارٹنر شپ (PPP) فار انفرااسٹرکچر ڈیولپمنٹ ایکٹ 2010 پاس کر کے اس طرح کی سرمایہ کاری کو قانونی تحفظ دیا۔ بجٹ 14-2013 کے پنجاب کے وائٹ پیپر میں بتایا گیا ہے کہ پبلک پرائیوٹ پارٹنر شپ سیل، منصوبہ بندی و ترقی کے محکمے کے اندر کام کرتا ہے۔ سیل نے سرکاری شعبے میں نجی سرمایہ کاری کا راستہ کھولنے کے لیے کسی منصوبے کو شروع کرنے، تیار کرنے اور چلانے سے لے کر اس کے سماجی اثرات کے تجزیے تک کے سات مرحلوں کے لیے رہنما اصول بنائے ہیں۔[36] سڑک، ٹرانسپورٹ، صحت اور خوراک کے شعبوں میں اس وقت اس پالیسی کے تحت تقریباً 80 بلین روپے کے منصوبے پنجاب میں چل رہے ہیں۔[37] ہم خوراک کے ایک منصوبے کو اس کے تحت دیکھتے ہیں۔ یہ گندم ذخیرہ کرنے کے گودام بنانے کا منصوبہ عالمی فنانس کارپوریشن (International Finance Corporation, World Bank/IFC) کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ اسے پی پی پی کی اسٹیئرنگ کمیٹی کی اجازت مل گئی ہے اور اب یہ دوبارہ IFC (آئی ایف سی) کے پاس ہے جو سودا طے کرنے میں مشاورت (Transaction Adviser) کا کام کرتا ہے۔ وہ اس میں ضروری ردو بدل کر کے سرمایہ کاری کی مارکیٹ کے حوالے کرے گا۔

اس کے علاوہ اب ہم کچھ خاص ترقیاتی منصوبوں کی طرف آتے ہیں جن کا تعلق آبپاشی، زراعت اور مال مویشی سے ہے۔ آبپاشی کے منصوبے سالانہ ترقی کے پروگرام کا ایک بڑا حصہ ہیں۔ بنیادی یا ترجیحی منصوبوں میں 12 فیصد منصوبے آبپاشی کے ہیں۔ ان پر خرچ ہونے والی رقم کا 90 فیصد 15 جاری منصوبوں کے لیے اور 10 فیصد چار نئے منصوبوں کے لیے ہے۔ ان میں جناح، خانکی، بلوکی اور سلیمانکی بیراجوں اور ہیڈ ورکس (headworks) کی بحالی کا کام شامل ہے۔ پانچ چھوٹے ڈیم ضلع اٹک میں بنائے جائیں گے جن سے 30,000 ایکڑ زمین زیر کاشت آئے گی۔ پنجاب میں زرعی پیداوار بڑھانے کے منصوبے میں 4.5 بلین روپے سے 7,000 نہروں اور نہری شاخوں کو پکا کیا جائے گا اور 120,000 ایکڑ اراضی پر بہتر نظام آبپاشی (High Efficiency Irrigation System) کو ممکن بنایا جائے گا۔ کسانوں کو 3,000 لیزر لیولرز

(laser levellers) دینا اس منصوبے کا حصہ ہے۔ برساتی پانی جو پچھلے سال سیلابی تباہی کا باعث بنا سنبھالنے کے انتظام، سیلاب سے بچاؤ اور نکاسی بہتر بنانے کے کام بھی جاری ہیں۔ بارانی علاقوں تک پانی کی فراہمی اور زیر زمین پانی کی سطح بلند کرنے پر بھی توجہ ہے۔ اس کے علاوہ بایو گیس اور شمسی ٹیوب ویل کے استعمال کو عام کرنے کے لیے حکومت نے ان کے استعمال پر کسانوں کو 7.5 بلین روپے کی زرتلافی دینے کا بھی اعلان کیا ہے۔[38]

زرعی تعلیم کے حوالے سے ملتان میں ایک نئی زرعی یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف ایگریکلچر فیصل آباد کا بورے والا میں نیا کیمپس قائم کرنے کا بھی پروگرام ہے۔ ایوب زرعی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کسانوں اور کام کرنے والی عورتوں کے نئے ہوسٹل اور لیہ میں زرعی شعبے میں کام کرنے والوں کے لیے تربیت کا سینٹر بنانے کا بھی ارادہ ہے۔

سالانہ ترقیاتی پلان میں زراعت اور مال مویشی کے حوالے سے تین باتوں پر زور ہے: (i) غذائی تحفظ کے چیلنج کو حاصل کرنا، (ii) پیداوار بڑھانا، (iii) زراعت اور مال مویشی کے شعبے کو براہ راست مارکیٹ سے جوڑنا اور زرعی اشیاء کو رسمی منظوری اور تصدیق (certification & accreditation) کے ذریعے معیاری بنانا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پنجاب کی 45 فیصد آبادی بالواسطہ یا بلاواسطہ زراعت سے وابستہ ہے۔ مال مویشی سے کسان کی 30 سے 40 فیصد تک آمدنی ہوتی ہے۔ ترقیاتی بجٹ میں مال مویشی اور ڈیری کی ترقی کے 1.4 بلین رکھے گئے ہیں۔ انہیں لیہ، میانوالی، خوشاب اور بھکر میں مارکیٹنگ کے ڈھانچے کو بہتر بنانے پر خرچ کیا جائے گا۔ بھیڑ اور بکری پر تحقیق کو فروغ دیا جائے گا۔ مال مویشی کی نسل بڑھانے کے کام کی تنظیم نو کے ساتھ پتوکی میں بھینسوں پر تحقیق کے انسٹی ٹیوٹ کو مضبوط اور چنیوٹ میں جانوروں کی سائنس کی یونیورسٹی (University of Veterinary & Animal Sciences/UVAS)، تشخیص کی لیبارٹری اور پنجاب کی دیہی پولٹری کو مضبوط کرنے کے بھی منصوبے ہیں۔[39]

پنجاب کے ترقیاتی بجٹ 14-2013 کے نئے زرعی منصوبے مندرجہ ذیل ہیں:

- کپاس کے ریشے (fibre) کے معیار کو جانچنے کی لیبارٹری کا قیام۔
- جینیاتی انجینئرنگ کو مناسب طور سے بڑھانا۔
- زیتون اور انگور کی کاشت کے فروغ کے لیے نچلی سطح پر کام کرنے ("micro-propagation techniques") کے طریقہ کار کا استعمال۔[40]

تبصرہ:

پنجاب کے بجٹ اخراجات ظاہر کرتے ہیں کہ معیشت کو چلانے والے پیداواری شعبوں کو جاری اخراجات میں خاطر خواہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات پنجاب کی معیشت میں استحکام کی علامت ہے۔ جب ہم سالانہ ترقیاتی بجٹ کو دیکھتے ہیں تو ترجیحات کچھ مختلف نظر آتی ہیں۔ سڑکوں کی تعمیر پر سب سے زیادہ رقم مختص کی گئی ہے۔ پیداواری شعبہ چھٹے نمبر پر نظر آتا ہے۔ ترقیاتی بجٹ وفاقی حکومت اور دیگر صوبوں کی طرح درمیانی مدت کے فریم ورک کا حصہ ہے۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ بیرونی امداد کی رقم کا سب سے زیادہ اثر ترقیاتی پروگراموں پر ہوتا ہے کیونکہ امداد کی زیادہ رقم ترقیاتی کاموں پر خرچ ہوتی ہے۔ ترقیاتی مقاصد کے ہدف نمبر چھ اور سات کی تفصیل اس بات کو واضح کرتی ہے۔ ایک طرف نجی شعبہ کو فروغ دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف غربت میں کمی کی آڑ میں ہنرمند افرادی قوت کو بڑھایا جا رہا ہے۔ یقیناً اس سے مزدور کی تعداد تو بڑھ جائے گی اور اس طرح مزید سستے ہنرمند مزدور دستیاب ہوجائیں گے۔ ہماری جڑوں میں بیٹھ کر ہمارے ہمدرد اپنے مفادات کو منڈی کی معیشت کے ذریعے فروغ دے رہے ہیں۔ بین الاقوامی امداد کے ذریعے یہ کام نہایت عمدہ طریقے سے ہو رہا ہے اور پنجاب کی حکومت اس کام میں نہایت گرم جوشی سے ایک سہولت کار کا روپ دھار چکی ہے۔

صوبہ سندھ:

حکومت سندھ کے بجٹ میں جاری خرچوں کا تخمینہ 355,900 ملین روپے ہے جبکہ سالانہ ترقیاتی پروگرام کے لیے 185,000 ملین روپے رکھے گئے ہیں۔ حکومت سندھ کی ترجیحات کو مندرجہ ذیل فہرست میں بالترتیب دیکھا جاسکتا ہے:

1۔ امن عامہ: 48,630 ملین روپے۔
2۔ لوکل گورنمنٹ: 39,300 ملین روپے۔
3۔ توانائی: 32,000 ملین روپے۔
4۔ تعلیم: 18,740 ملین روپے۔ 13,480 ملین روپے سالانہ ترقیاتی پروگرام کے ذریعے الگ سے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ خرچہ سندھ ایجوکیشن ریفارم پروگرام (SERP-II) کا ہے جس میں عالمی بینک 400 امریکی ڈالر دے گا۔
5۔ سڑک اور شاہراہ: 16,800 ملین روپے۔
6۔ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام (BISP): 12,000 ملین روپے۔ دیگر غربت دور کرنے کے منصوبے تقریباً پونے 3,000 ملین روپے۔
7۔ آبپاشی: 12,000 ملین روپے۔
8۔ زراعت: 6,160 ملین روپے۔
9۔ نوجوانوں کے لیے روزگار کی فراہمی کے منصوبے: 3,000 ملین روپے۔
10۔ مال مویشی: 2,800 ملین روپے۔
11۔ ماہی گیری: 868.61 ملین روپے۔
12۔ ٹیکنیکل ٹریننگ: 785.710 ملین روپے۔

اس کے علاوہ کچھ بڑے منصوبے ہیں جن میں کراچی سرکلر ریلوے کے لیے 2,600 بلین امریکی ڈالر کا منصوبہ ہے۔ اس منصوبے کو جاپان کی بین الاقوامی امداد کی ایجنسی (Japan International Cooperation Agency/JICA) کی امداد حاصل ہے۔[41]

اپنی بجٹ تقریر میں زراعت کا ذکر کرتے ہوئے سندھ کے وزیر اعلیٰ سید

قائم علی شاہ نے کہا تھا کہ زراعت سندھ کی معیشت کی بنیاد ہے صوبے کے 60 فیصد لوگ اس سے روزگار حاصل کرتے ہیں۔ پاکستان کی کل آمدنی (جی ڈی پی) کا 23 فیصد زراعت سے آتا ہے۔ پاکستان کی چاول کی کل پیداوار کا 32 فیصد، گنے کی 24 فیصد، کپاس کی 21 فیصد اور گندم کی 12 فیصد سندھ پیدا کرتا ہے اور یہ سب کسانوں کی سخت محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کے باوجود خرچوں کی ترجیحات میں زراعت کا شعبہ سندھ کی بجٹ خرچوں میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ اس شعبے میں جو خرچے ہورہے ہیں ان کا ذکر وزیر اعلیٰ سندھ نے ان الفاظ میں کیا: ''تیزی سے زرعی مشینری کے استعمال کے فروغ کے لیے زرعی اوزار کی فراہمی، ٹریکٹر کے لیے زرتلافی، بہتر بیج اور فرٹیلائزر کا استعمال، ٹیوب ویل پر زرتلافی، بلڈوزر کے ذریعے زمین کی تیاری اور فصل کے کٹنے سے پہلے بچاؤ کے طریقوں کے لیے حکومت کا محکمہ زراعت کام کررہا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ سے کپاس کی پیداوار میں 44.2 فیصد اور گنے کی پیداوار میں 48 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اس پیداوار میں اضافے سے کیا سندھ کے چھوٹے کسانوں کے حالات بہتر ہورہے ہیں؟ اس کا جواب وزیر اعلیٰ کے پاس نہیں۔ ایسی بے ثمر ترقی کی لمبی فہرست ہے۔ جس کی کچھ تفصیل کو ترقیاتی بجٹ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ترقیاتی بجٹ:

زرعی معیشت میں پانی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ زراعت میں پانی کے استعمال کے نئے طریقوں پر عمل درآمد ہورہا ہے جن میں ڈرپ (Drip) اور اسپرنکلر (Sprinkler) سسٹم شامل ہیں۔ پانی کے چار بڑے منصوبوں پر بھی کام جاری ہے۔ ان میں پورے سندھ میں آبپاشی اور نکاسی کے نظام کی بحالی اور بہتری پر کام ہورہا ہے۔ سیہون سے لے کر سمندر تک رائٹ بینک آؤٹ فال ڈرین (Right Bank Outfall Drain/RBOD) کی توسیع کی جارہی ہے۔ نہروں اور نہری شاخوں کو پکا کرنے کے علاوہ چھوٹے ڈیموں کی تعمیر کے منصوبوں پر بھی کام ہورہا ہے۔ 14-2013 میں پانی اور نکاسی کے 213 منصوبے شروع کیے جائیں گے جن میں سے 75 کو جون 2014 تک مکمل کیے جانے کا امکان ہے۔

مال مویشی کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو دیکھتے ہوئے جھنبور میں جدید ڈیری گاؤں (Dairy Village) اور گوشت کے لیے پروسیسنگ زون 1300 ایکڑ پر بنایا جارہا ہے۔ اس کا مقصد مقامی اور بین الاقوامی مارکیٹ تک رسائی کے لیے جدید ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ مال مویشی کے معیار اور پیداوار کو بہتر بنانے کے لیے شہید بے نظیر بھٹو یونیورسٹی آف ویٹرنری اینڈ اینیمل سائنسز (Veterinary and Animal Sciences) لاڑکانہ میں قائم ہوچکی ہے۔ 14-2013 کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں تین اضلاع تھرپارکر، عمرکوٹ اور خیرپور میں ڈسٹرکٹ اور پرائیوٹ پارٹنرشپ پروگرام کے تحت مال مویشیوں کی کالونیاں بنائی جارہی ہیں۔[42] ماہی گیری کے شعبے میں تجارت کے فروغ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کراچی فش ہاربر پر مچھلی کی پروسیسنگ کو عالمی معیار کے مطابق بنایا جارہا ہے۔[43] اس کے علاوہ بے نظیر بھٹو یوتھ ڈیولپمنٹ پروگرام کے ذریعے بے روزگار نوجوانوں کو مختلف زرعی شعبوں میں تربیت بھی دی گئی ہے۔

تبصرہ:

سندھ کے تجزیے کے لیے وائٹ پیپر دستیاب نہیں تھا۔ اس لیے اخبارات اور دیگر ذرائع سے یہ کمی پوری کی گئی ہے۔ بجٹ کی ترجیحات میں زراعت ساتویں نمبر پر آتا ہے۔ زراعت کے لیے جتنی رقم مختص ہے اس سے دگنی رقم غربت میں کمی لانے پر خرچ ہورہی ہے۔ صنعت کا ترجیحات کی فہرست میں ذکر ہی نہیں۔ سندھ میں بڑھتی ہوئی غربت کی کچھ وجوہات یہیں واضح ہوجاتی ہیں دیہی آبادی کے تحفظ کا بڑا ذریعہ مال مویشی ہیں۔ انہیں بھی بڑی تیزی سے کارپوریٹ شعبے کی نذر کردیا گیا ہے۔ اسی طرح ماہی گیر مررہا ہے لیکن ماہی گیری کی تجارت فروغ پارہی ہے۔ سندھ میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح ترقی برائے منڈی ہورہی ہے۔ ایسی ترقی خود انحصاری اور عوامی ترقی کی نفی ہے۔

بجٹ 14-2013 کا مجموعی تنقیدی جائزہ

یہ مضمون واضح کرتا ہے کہ ملک کو نیولبرل یا منڈی معیشت کے دلدل میں پھینک دیا گیا ہے، یہ سوچے بغیر کہ اپنی عوام دشمنی کی وجہ سے دنیا میں یہ نظام ناکام ہوکر عالمی معیشت کو بھی بحران سے دوچار کرچکا ہے۔ اسی لیے ملک کی معیشت کو بحران سے نکالنے کا دعویٰ کرنے والے وزیر خزانہ اسحاق ڈار کی بجٹ تقریر متضاد باتوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ ایک ممتاز صحافی کے مطابق یہ اس لیے ہے کیونکہ:

> ''تمام کوشش جو معیشت کو الجھاؤ سے نکالنے اور بڑے اقتصادی مسائل میں استحکام لانے کے لیے کی جارہی ہے، ناکام ہوچکی ہے۔ فنڈ کی شرائط، ترقی میں رکاوٹ، ملازمت میں کمی، افراط زر میں اضافہ اور تجارت میں عدم توازن پیدا کرتی ہے جس سے بجٹ خسارے میں اضافہ اور مزید اندرونی اور بیرونی قرضے لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔''[44]

ہم جب وفاقی حکومت کی آمدنی اور خرچوں کو دیکھتے ہیں تو جو مسائل سامنے آتے ہیں وہ بھی اوپر دیئے گئے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثلاً ہماری آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ عوام سے حاصل ٹیکس کی آمدنی ہے۔ زیادہ آمدنی والے طبقے پر براہ راست ٹیکس بڑھانے کے بجائے بالواسطہ ٹیکس لگا کر مہنگائی میں اضافہ کیا جارہا ہے جس کا بوجھ براہ راست غریب عوام پر پڑتا ہے اور مزید غربت کی صورت حال سامنے آتی ہے۔ پھر اسے دور کرنے کے لیے حکومت کو ''حفاظتی جال'' (safety nets) بنانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ خرچوں کی فہرست میں اس حوالے سے خاصی لمبی چوڑی رقم درکار ہوتی ہے۔ حکومت اسی گورکھ دھندے میں گھومتی رہتی ہے۔

ٹیکس کے علاوہ وفاقی حکومت کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ اگرچہ پہلے ذریعے سے بہت چھوٹا ہے لیکن اس کے قدم کے نشان (foot prints) بہت بڑے ہیں۔ یہ ذریعہ بیرونی امداد اور گرانٹس کا ہے۔ کیری لوگر بل اس کی صرف ایک مثال ہے جس کے تحت پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شامل ہونے کے بعد امریکہ سے امداد حاصل کی۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان کو اس جنگ میں کم از کم 35 سے 40 بلین ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا[45] جبکہ 2009 سے 2014 کے دوران پاکستان کو امریکہ سے کل 7.5 بلین ڈالرز کی فوجی اور سویلین مقاصد کے لیے امداد ملی۔ سویلین امداد کے ذریعہ امریکہ نے اچھی طرح ہماری جڑوں میں بیٹھ کر ہماری معیشت کو نیو لبرل معیشت سے ہم آہنگ کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

جب وفاقی خرچے سامنے آتے ہیں تو سب سے بڑا خرچہ قرضوں کی واپسی کا ہے۔ جب قومی بجٹ خسارے میں ہوں تو قرض پر ہی تکیہ کیا جاتا ہے۔ خسارے کی بڑی وجہ فوجی خرچ ہے۔ اگر اس کی سیاسی بحث سے ہٹ کر ہم صرف بجٹ پر توجہ دیں تو ایک اور بات کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے اپنے بنیادی پیداواری شعبے جن سے معیشت کا پہیہ چلتا ہے وہ نظر انداز ہو رہے ہیں۔ ان میں زراعت اور صنعت سب سے اہم ہے۔

زراعت سے عوام کی اکثریت اب بھی منسلک ہے۔ اگر یہ شعبے خود انحصاری کی بنیاد پر اپنے پیروں پر کھڑے ہوں تو بیرونی امداد کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اور ملک صحیح معنوں میں ترقی کرے۔ مگر ہماری تاریخ ثابت کرتی ہے کہ صنعتی خود انحصاری کو 50 کی دہائی میں اور زرعی خود انحصاری کو پہلے منصفانہ اور مساویانہ زمینی اصلاحات کو نظر انداز اور سبز انقلاب کو لاگو کر کے خیر باد کہنا شروع کر دیا تھا۔ 1995 میں ڈبلیو ٹی او کے قیام نے نیولبرل مارکیٹ معیشت کے ذریعے ہماری معیشت کے کمزور پاؤں پوری طرح سے کاٹنے کا انتظام کیا۔ آج حال یہ ہے کہ قومی بجٹ میں سب سے کم رقم انھی شعبوں کے لیے رکھی جارہی ہے، نتیجے میں نجکاری کے ذریعے قیمتی سرکاری اثاثے تک بیچنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ دوسری طرف زراعت اور خوراک میں زرتلافی کو بھی کم کرنے کی طرف رجحان ہے جبکہ اس زرتلافی کی ضرورت بھی محتاج زراعت کو پیش آتی ہے، پائیدار اور خود مختار زراعت اس قسم کی بیساکھیوں پر کم ہی بھروسہ کرتی ہے۔ وفاقی بجٹ کی بحث میں آخر میں ان خرچوں کی طرف آتے ہیں جو خاص مارکیٹ معیشت کا تحفہ ہیں یعنی بھوک اور غربت کے حوالے سے خرچے بڑھتے ہی چلے جارہے ہیں اور حکومت انہیں پورا نہیں کر پارہی ہیں۔ کیونکہ وہ انھیں دور کرنے کے لیے منڈی کے طریقہ کار ہی کو اپنائے ہوئے ہے۔ قومی تحفظ خوراک اور تحقیق کی وزارت اور اس کی غربت اور بھوک دور کرنے کی پالیسیاں بھی اسی سوچ کی پیداوار ہیں۔[46]

پنجاب کے علاوہ تمام صوبوں نے پیداواری شعبے کو پس پشت ڈالا ہوا ہے۔ تعلیم، صحت اور غربت دور کرنے پر توجہ بہت اچھی بات ہے لیکن یہ ایجنڈا کہاں سے آرہا ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایجنڈا ملینیم ترقیاتی اہداف کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے جس کے عالمی اہداف نیولبرل سوچ کے تحت 2000 میں عالمی طور پر طے کیے گئے تھے۔ اس میں تعلیم، صحت اور غربت دور کرنے کے حوالے سے اہداف مقرر کیے گئے ہیں۔ ہمارے بجٹ میں سماجی شعبوں کی طرف جھکاؤ انہی اہداف کی وجہ سے آیا، تعلیم، صحت اور غربت کی فکر میں نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو خدمات پر سیلز ٹیکس لگا کر آمدنی بڑھانے کا مشورہ وفاقی حکومت صوبوں کو نہ دیتی۔ اس بالواسطہ ٹیکس سے مہنگائی میں اضافہ غربت میں اضافے کا ایک اور سبب بنے گا اور اس کے تعلیم اور صحت دونوں پر منفی اثرات پڑیں گے۔

جب ہم ترقیاتی منصوبوں کو دیکھتے ہیں جن میں بیرونی امداد سے چلنے والے منصوبے کافی زیادہ ہوتے ہیں تو کچھ اور حقیقتیں آشکار ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ تمام بجٹ وائٹ پیپر جب ترقیاتی پروگرام کے صفحوں پر پہنچتے ہیں تو تقریباً ایک جیسی ہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اصلاحات ایجنڈے کے بنے بنائے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ کچھ جاری منصوبے ہیں اور کچھ آئندہ دو سالوں کے منصوبوں کی فہرست ہے۔ بہتر ہے کہ پیداواری شعبوں میں ہر صوبے میں پانی پر بہت توجہ دی جارہی ہے کیونکہ اب توانائی کے بحران کے بعد پانی کا بحران ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ جب پانی کے منصوبوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو کہیں اسپرنکلر اور ڈرپ نظام کے ذریعے پانی بچانے کے طریقے آزمائے جارہے ہیں تو کہیں اس کے ضائع ہونے کا انتظام بھاری زرتلافی کے ساتھ بایوگیس اور شمسی ٹیوب ویل کے ذریعے ہو رہا ہے۔ دراصل سبز ٹیکنالوجی کا فروغ، سبز ٹیکنالوجی کے ذریعے موسمی تبدیلی سے مقابلہ کرنے کی آڑ میں مغربی ممالک کی معیشت کو بحران سے نکالنے کے بڑے منصوبے کا حصہ ہے۔ یوں ترقیاتی منصوبوں میں عوام کی خیرخواہی کے بجائے سرمایہ دار ممالک اور ان کے کارپوریٹ شعبے کے مفاد واضح نظر آتے ہیں جو لفظ ''زرعی ترقی''، ''زیادہ پیداوار''، ''غذائی تحفظ''، ''ایگری بزنس'' جیسے الفاظ کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں۔ ساری ''ترقی'' انھی الفاظ کے گرد ہو رہی ہے جن میں عالمی امداد کے ذریعے پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ حکومتی کاموں کے اندر داخل ہو رہی ہے۔ برآمدات کے فروغ پر مبنی ترقی کا دھوکہ دے کر ''عوام کے ہمدرد'' ترقیاتی پلان بنا رہے ہیں جبکہ عالمی تجارت میں پاکستان کا حصہ 1999-2009 کے درمیان 0.21 فیصد سے کم ہو کر 0.13 فیصد رہ گیا۔ ایسی لاحاصل معاشی ترقی کے پیچھے دوڑنے کے لیے عوام سے مزید کیا کیا قربانیاں لی جائیں گی؟

زراعت جو ایک بنیادی پیداواری شعبہ ہے، اس وقت مضبوط ہوگا جب وہ محتاج نہ ہو، پائیدار ہو۔ اس کے لیے کسانوں میں زمین کی منصفانہ تقسیم پہلا مرحلہ ہے۔ لیکن یہ دیکھا جارہا ہے کہ زمین کارپوریٹ فارمنگ اور دیگر منصوبوں کے لیے سستے دام اور بے تحاشہ مراعات کے ساتھ بیرونی سرمایہ کاری کے لیے دی جارہی ہے۔ شاید اسی لیے بیرونی دلچسپی کے ساتھ بڑی تیزی سے زمینی ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ کیا جارہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زمین کی منصفانہ تقسیم کے بعد اگر اس زمین پر سب سے پہلے کسان اپنی غذائی ضرورت پوری کرتے ہیں تو پھر حکومت کو بھوک اور غربت کی فکر

کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہاں مگر عالمی سطح پر بڑی مچھلیوں کا اس سے پیٹ نہیں بھر سکے گا۔ یہ عالمی لالچ ہے جو ہمیں بھوکا رکھتی ہے۔ اسی طرح اگر ہماری اپنی صنعتیں ہماری ضرورتیں پوری کریں گی تو ہمیں وہی درآمدی سامان چاہیے ہوگا جس کی ہم کو واقعی ضرورت ہوگی۔ ہم غیر ضروری اشیاء کی درآمد پر قیمتی زرمبادلہ ضائع نہیں کریں گے۔ باہر سے کمپنیاں آ کر ہمارے وسائل پر قبضہ نہیں کر پائیں گی۔ ایسی پائیدار معیشت جلد ہمیں بیرونی قرض اور بجٹ خسارے سے چھٹکارا دلا سکتی ہے اس کے لیے ہمیں قیمتی قومی اثاثوں کو بیچنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ درد کی گولی کھا کر بیماری دور نہیں ہوتی، بیماری کی صحیح تشخیص ہی اس کا اعلاج ہے اور ہمیں اس عمل سے گزرنے کی سخت ضرورت ہے۔

حوالہ جات

1. Government of Khyber Pakhtunkhwa (KP), Finance Department, "White Paper, Budget 2013-14." Government of KP, 2013, p. 54, accessed from http://www.financekpp.gov.pk/FD/attachments/article/236/White%20Papers%202013-14.pdf

2۔ ایضاً۔

3. Government of Pakistan, Finance Division. "Budget in Brief, Federal Budget 2013-14." Islamabad, pp. 44-45.

4. The News. "Text of Finance Minister Ishaq Dar's Budget 2013-14 Speech," 13 June, 2013, p. 9.

5۔ ایضاً۔

6۔ وفاقی حکومت جو ٹیکس وصول کرتی ہے ان کی فہرست یہ ہے: آمدنی پر ٹیکس، ویلتھ ٹیکس، کیپٹل ویلو ٹیکس، تمام درآمد، برآمد، پیدا، تیار اور استعمال کی جانے والی اشیا جو بیچی یا خریدی جاتی ہیں پر ٹیکس، کپاس پر برآمدی ڈیوٹیز، کسٹم ڈیوٹیز، فیڈریل ایکسائز ڈیوٹی (اس میں گیس پر ایکسائز ڈیوٹی شامل نہیں)۔ کوئی اور ٹیکس جو وفاقی حکومت لگائے۔

7. Government of Pakistan. "Budget in Brief," p. 18.

8۔ ایضاً، صفحہ 33۔

9۔ زرتلافی کی کل رقم کا 68.7 فیصد واپڈا اور PEPCO اور 22.9 فیصد KESC سے بجلی حاصل کرنے کی مد میں ہے۔

10. Government of Pakistan, Finance Division. "Economic Survey 2012-13." Government of Pakistan, Islamabad, p. 17.

11. Government of Balochistan, Finance Department, "White Paper Budget 2013-14." Government of Balochistan 2013, p. 17. Accessed from http://www.balochistan.gov.pk; "White Paper Budget 2013-14." Government of KP, 2013, p. 16; White Paper Budget 2013-14." Government of Punjab, 2013, p. 10, accessed from http://punjab.gov.pk/system/files/White_Paper_2013-14.pdf

نوٹ: سندھ کا وائٹ پیپر بجٹ سے پہلے جاری نہیں ہوا تھا اس لیے سندھ کے اعداد و شمار کئی جگہ نہیں مل پائے۔

12۔ پنجاب میں حافظ آباد ڈسٹرکٹ کا زمینی ریکارڈ کمپیوٹرائز ہوچکا ہے اور باقی اضلاع میں یہ کام جاری ہے جبکہ خیبر پختون خواہ میں حکومت پہلے ایبٹ آباد، پشاور، ڈیرہ اسماعیل خان، مرادان، چارسدہ اور نوشہرہ کا لینڈ ریکارڈ کمپیوٹرائز کررہی ہے۔

13. White Paper, Government of Balochistan, p. 22; White Paper, Government of KP, p. 19; White Paper, Govt of Punjab, p. 16.

14. White Paper, Government of Balochistan, p. 7; White Paper, Government of KP, p. iii; White Paper, Government of Punjab, p. iv. Fakhri Associates, "Sindh budget 2013-14, Fiscal measures for FY 2013-14," Fakhri Associates, Karachi, 2013.

15. White Paper, Government of Balochistan, p. 58.

16۔ ایضاً، صفحہ 63۔

17۔ فہرست کے لیے دیکھیں ایضاً، صفحہ 66-70۔

18. White Paper, Government of KP, p. 1.

19۔ ایضاً، صفحہ 14-15۔

20۔ ایضاً، صفحہ 71۔

21۔ ایضاً، صفحہ 80۔

22۔ ایضاً۔

22۔ ایضاً۔

24۔ ایضاً، صفحہ 81-82۔

25۔ ایضاً، صفحہ 96۔

26۔ ایضاً، صفحہ 96-97۔

27۔ ایضاً، صفحہ 97۔

28۔ ایضاً، صفحہ 98۔

29. Daily Dawn. "Punjab focus on large investment spending." 18 June 2013, Karachi.

30۔ ایضاً۔

31. White Paper, Government of Punjab, p. 68.

32۔ ایضاً، صفحہ 66-67۔

33۔ ایضاً، صفحہ 68۔

34۔ ایضاً، صفحہ 51-52۔

35۔ ایضاً۔

36۔ ایضاً، صفحہ 64۔

37۔ ایضاً، صفحہ 65۔

38۔ ڈان، 18 جون، 2013، صفحہ 2۔

39۔ ایضاً۔

40. White Paper, Government of Punjab, p. 60.

41. Sindh Budget 2013-14.

42. Associated Press of Pakistan, "Sindh Govt presents Rs. 617 billion outlay 2013-14," Associated Press of Pakistan, 6 September, 2013.

43۔ ایضاً۔

44. M Ziauddin, "Seeking a new economic model", The Express Tribune, 6 Nov, 2013. p. 7.

45. Junaid Zahid, "Acts of terror and economic cost", The Express Tribune, 22 Sep, 2013, p. 11.

46۔ ولی حیدر، ''تحفظ خوراک اور غذائیت کی قومی پالیسی: ایک تنقیدی جائزہ'' چیلنج، جلد 6، شمارہ نمبر 1، صفحہ 24-30۔

بات تو سچ ہے مگر

پاکستانی زراعت کو امریکی امداد ملتی رہے گی: امریکہ

قائم مقام امریکی کونسل جنرل جیفری این بیکن (Jeffrey N Bakken) نے کہا کہ پاکستان کی دیہی ،ڈیری اور لائیو اسٹاک معیشت کو ملنے والی امریکی حکومت کی امداد جاری رہے گی۔ لاہور میں ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک کروڑ 40 لاکھ ڈالرز کا یہ منصوبہ نو ہزار چھوٹے گوالوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوگا۔ اس سے ان کی پیداوار بڑھے گی اور آمدن میں دس فیصد اضافہ ہوگا۔ اداروں، بڑھوتری اور ترقی پر ہونے والی یہ کانفرنس امریکہ کے عالمی امدادی ادارے یو ایس ایڈ (USAID) کی مدد سے چلنے والے ڈیری پراجیکٹ اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی (GCU) کے اشتراک سے منعقد کی گئی تھی۔

(دی نیوز، 3 مئی، 2013، صفحہ 17)

ملک کا پہلا زرعی ایکسپورٹ زون تکمیل کے قریب

کراچی میں ملک کا پہلا زرعی ایکسپورٹ پراسیسنگ زون (Agri Export Processing Zone/AEPZ) رواں سال کے آخر تک کام شروع کردے گا۔ 10 کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر ہونے والے اس زون میں جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے پھلوں اور سبزیوں کو برآمدی شکل میں ڈھال کے عالمی مارکیٹ میں برآمد کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے اگانے والے (growers) اور شہر میں بکھرے ہوئے برآمد کنندگان ایک ہی چھت تلے جمع ہوجائیں گے۔ اگانے والوں کو اپنی اشیاء کو تیاری کے مراحل سے گزارنے (پراسیسنگ) اور برآمد کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم میسر آجائے گا۔ یوں پراسیسنگ زون کے صاف ستھرے ماحول میں معیار کے تصدیق نامے رکھنے والی مصنوعات کے لیے عالمی منڈی میں جگہ بنانا آسان ہو جائے گی۔

سندھ حکومت ایسے ہی زرعی ایکسپورٹ پراسیسنگ زون پھل اور سبزیاں اگانے والے بڑے اضلاع بشمول ہوسری نزد حیدرآباد، بدین، گھوٹکی، نوشہرو فیروز اور میرپور خاص میں بھی قائم کرے گی۔

صوبائی ڈپٹی سیکرٹری برائے زراعت ابرار شیخ نے ''ڈان'' کو بتایا کہ حکومت سندھ نے AEPZ (اے ای پی زیڈ) کو پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کے طور پر ''سیکورٹیز اینڈ ایکس چینج کمیشن آف پاکستان'' (Securities and Exchange Commission of Pakistan/SECP) میں رجسٹر کرانے کا فیصلہ کیا ہے تا کہ اسے شفاف اور منافع بخش طریقے سے چلایا جاسکے۔ زون کے معاملات کو سات رکنی بورڈ آف ڈائریکٹرز چلائے گا جس کے پانچ ارکان نجی شعبے سے اور دو ارکان حکومت سے لیے جائیں گے۔ اسٹیک ہولڈرز پر مشتمل نجی انتظامیہ انتظامی اور ایگزیکٹو امور سرانجام دے گی اور زون کی آئندہ ترقی کے منصوبے بھی بنائے گی۔ بورڈ میں شامل حکومتی نمائندگان انتظامی امور میں شفافیت اور مساوات کو یقینی بنائیں گے تا کہ حکومت کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکے۔

زون سپرہائی وے پر ناردرن بائی پاس کی حدود میں واقع ہے۔ یوں برآمدی مصنوعات کو بندرگاہ تک پہنچانے میں آسانی ہوگی۔ اسی طرح ایک رابطہ سڑک زون کو کراچی ایئرپورٹ سے ملاتی ہے۔

(ڈان، 3 مئی، 2013، صفحہ 9)

شوگر مل مالکان کی جانب سے کسانوں کا استحصال

پنجاب کے اضلاع جڑانوالہ، فیصل آباد اور ننکانہ صاحب کے چھوٹے کسان شوگر مل مالکان کے استحصالی ہتھکنڈوں کا شکار ہیں۔ کسانوں نے مل مالکان کو جنوری اور فروری میں گنے کی فصل دے دی تھی جس پر انھیں ایک کمپیوٹرائزڈ سی پی آر (CPR) نامی پرچی دے کر کہا گیا کہ وہ اپنے واجبات بینک سے وصول کرلیں۔ جب سے یہ کسان بینک کے چکر لگا رہے ہیں لیکن اب تک انھیں رقم نہیں ملی۔ کسانوں کو ان کی رقم مل مالکان کے ایجنٹوں کے ذریعے مل سکتی ہے اگر وہ اپنے گنے کی فصل کے دام میں دس سے پندرہ روپے فی چالیس کلو کمی پر راضی ہو جائیں۔ سوال یہ ہے کہ ان ایجنٹوں کو ملوں سے رقم کیسے وصول ہو جاتی ہے؟

(ڈان، 7 مئی، 2013، صفحہ 6)

پنجاب میں زرعی اصلاحات کے لیے تجاویز

بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر پنجاب کو گندم کی پیداوار موجودہ 18.5 ملین ٹن سے بڑھا کر اگلے پانچ سال میں 20 ملین ٹن سے زائد پر لانی ہوگی۔ اسی طرح چاول کی فصل 3.2 ملین ٹنسے بڑھ کر 3.5 ملین ٹن، مکئی 3.5 ملین ٹن اور گنے کی پیداوار 50 ملین ٹن پر لانے کی ضرورت ہے۔

زرعی ٹیکنالوجی کو متعارف کرانے کے لیے ایک مکمل نظام ہونا چاہیے۔ پانچ پانچ ایکڑ زمین کے مالک 90 فیصد سے زیادہ کسانوں کے لیے تربیت، آگاہی اور ٹیکنالوجی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہاں حکومت کا پانچ سالہ منصوبہ ان کے کام آسکتا ہے۔ ایک پالیسی کے تحت کمیونٹی کاشت کاری کے لیے کسانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور تنظیموں کے ذریعے انھیں تمام سہولیات مہیا کی جائیں۔ اگر ایک دفعہ کسان اپنے

پیروں پر کھڑے ہوجاتے ہیں تو صوبہ زراعت کی دوسری شکلوں مثلاً کارپوریٹ زراعت کا تجربہ کرسکتا ہے۔

زراعت کسانوں کے گرد گھومتی ہے۔ جب تک انھیں پالیسی سازی میں شامل نہیں کیا جائے گا، کامیابی کے امکانات معدوم رہیں گے۔

(احمد فراز خان، ڈان، 20 مئی، 2013، صفحہ iii)

ملک کے بالائی علاقوں کے کسانوں کی حالت زار

ملک کے بالائی شمالی پہاڑی علاقوں میں چھوٹے کسانوں کو اپنی بقاء کے لیے جہاں موسم کی سختیوں سے لڑنا پڑتا ہے وہاں ہر سال موسم میں آنے والی تبدیلیوں نے ان کی فصلوں کی پیداوار کو انتہائی کم کردیا ہے۔ خیبر پختونخوا کے ضلع بٹ گرام میں واقع الائی وادی کے دور افتادہ مقام پر رہنے والے کسان جہانزیب شاہ کا کہنا ہے کہ اس سال ہماری فصلیں تباہ ہوگئی ہیں۔ اس دفعہ سردی کا موسم لمبا ہوگیا جس کے باعث بوائی میں تاخیر ہوگئی لیکن اس وقت تک موسم بہت خشک ہوچکا تھا، گھاس بھی زیادہ نہیں اگ سکی۔ اب اگر بارش ہوتی بھی ہے تو بھی اتنی گھاس نہیں اگے گی کہ جو اگلے موسم سرما میں ہمارے مویشیوں کے لیے کافی ہو۔ ہمیں اپنے چند مویشیوں کو بیچنا پڑے گا لیکن وہ پہلے ہی دبلے ہیں اس لیے ان کے دام کم ملیں گے۔ پھر ہرکوئی اسی مجبوری کی وجہ سے اپنے مویشی بیچ رہا ہوگا جس کا فائدہ ڈیلر اٹھائیں گے اور بہت کم قیمت دیں گے۔

اس علاقے میں اگائی جانے والی روایتی فصلیں کھیرے، پھلیاں اور مکئی بہت خراب اور بہت کم اگی ہیں جس کا مطلب ہے کہ پیداوار کم ہوگی۔ فصل کا معیار اور اگلی فصل کے لیے محفوظ کیے گئے بیجوں کا معیار بھی کم تر ہوگا۔

جہانزیب شاہ نے بتایا کہ اس سے پہلے بھی برے سال آتے تھے لیکن ان کے بعد زیادہ پیداوار دینے والے سال بھی آتے تھے، یوں ہم کھینچ تان کر گزر بسر کرلیتے تھے۔ لیکن پچھلے چند سال تو مسلسل برے چل رہے ہیں، ہماری جمع پونجی ختم ہوچکی ہے، اسی لیے میں اور میرے بعض رشتے دار مزدوری کی تلاش میں جنوب کی طرف جارہے ہیں۔ یہ اس علاقے کی روایت بن چکی ہے کہ ہر گھر کا کم از کم ایک فرد ملازمت کی تلاش میں گھر سے دور جاتا ہے۔ اس کے بھیجے گئے پیسوں سے گھر کی بنیادی ضروریات کی اشیاء خریدی جاتی ہیں جو کہ چند عشرے پہلے گھر میں ہی پیدا کی جاتی تھیں۔ اب خرچے بڑھ گئے ہیں۔ فوری رابطے کے لیے موبائل فون چاہیے جس کے لیے رقم درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر کو دکھانے اور دوائیاں خریدنے کے لیے بٹ گرام اور ایبٹ آباد جانا پڑتا ہے۔

الائی کے لوگ بدلتے عالمی موسمی حالات سے واقف نہیں ہیں۔ وہ اپنے مسائل کی جڑ اکتوبر 2005 کے شدید زلزلے کو قرار دیتے ہیں۔ جہانزیب کا کہنا ہے کہ زلزلے نے ضرور ہمارے موسم کے ساتھ کچھ کردیا ہے۔ ہر سال ہماری فصلیں کم ہورہی ہیں۔ یہ صورت حال جاری رہی تو اگلے ایک دو سال میں بھینسوں کو تیار کرنے، کھیتوں میں ہل چلانے، بیج بونے اور فصل کا انتظار کرنے کی مشقت سے گزرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیوں کہ کچھ اگے گا ہی نہیں۔

(ایکسپریس ٹریبیون، 6 جون، 2013، صفحہ 7)

مونسانٹو کی مکئی کے نئے ہائبرڈ بیجوں کو بیچنے کی کوششیں

مونسانٹو پاکستان نے تقریباً چار سو کسانوں کو اپنے ایک تربیتی سنٹر ''ڈی کیب ٹریننگ سنٹر'' کا دورہ کروایا۔ یہ کسان ساہیوال میں مونسانٹو کی زمینوں پر ہائبرڈ مکئی کی آزمائشی کاشت دیکھنے آئے تھے۔ اس دورے کے دوران مونسانٹو کے زرعی ماہرین اور کسانوں کے درمیان ہونے والی بحث و مباحثہ کا خلاصہ کچھ یوں ہے: ہائبرڈ بیجوں کے آنے سے کسانوں نے روایتی بیجوں کا استعمال تو چھوڑ دیا ہے لیکن غیر معیاری ہائبرڈ بیجوں اور کاشت کاری کے پرانے طریقوں کے استعمال کی وجہ سے وہ مطلوبہ پیداوار حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔ کسانوں کو پیداوار بڑھانے کے لیے لازماً بہترین کوالٹی کے ہائبرڈ بیج استعمال کرنے چاہئیں۔ بدلتے موسمی حالات کے پیش نظر اچھی کوالٹی کے بیج کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیوں کہ یہ سخت موسمی حالات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، فصلوں کی کاشت کی ترتیب بدلنے سے بھی متاثر نہیں ہوتے اور سب سے بڑھ کر کسانوں بالخصوص چھوٹے کسانوں کو زیادہ منافع دیتے ہیں۔

کسانوں کا یہ دورہ مونسانٹو پاکستان کی اس مہم کا حصہ ہے جس کے تحت کسانوں کو مونسانٹو کی موجودہ اور نئی مکئی کی مصنوعات کا معائنہ کروایا جاتا ہے اور زرعی سائنس کا استعمال سمجھایا جاتا ہے۔ ایسے ہی پروگرام اس سے قبل چنیوٹ، اوکاڑہ اور دیپال پور میں بھی منعقد کیے گئے۔ کسانوں کے اس دورے کا بنیادی مقصد تو انھیں تعلیم دینا تھا تاہم کھیتوں میں جدید ہائبرڈ ''ڈی کیب'' مکئی کی کارکردگی دکھانا بھی مقصود تھی۔

مونسانٹو کے کمرشل آپریشن کے سربراہ محمد الیاس ندیم نے کہا کہ پاکستان میں پیدا ہونے والی آدھی سے زیادہ مکئی مرغیوں کی خوراک (پولٹری فیڈ) میں خام مال کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ایک چوتھائی صنعتی نشاستہ (starch) اور بقیہ انسانی استعمال اور مویشیوں کے چارے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ پاکستان مکئی کی مانگ کو بمشکل پورا کررہا ہے کیوں کہ صنعت میں اس کی طلب بڑھتی جارہی ہے۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 28 جون، 2013، صفحہ 10)

زرعی اصلاحات کی ضرورت

اکمل حسین جو کہ نامور معاشیات کے پروفیسر ہیں نے بڑھوتری کو فروغ دینے کے لیے ایک لائحہ عمل پیش کیا ہے جس کی بنیاد زرعی اصلاحات پر مبنی ہے۔ پروفیسر اکمل کا کہنا ہے کہ 1960 کے عشرے کے آخر سے آنے والی حکومتوں نے بڑے کسانوں کے لیے

حکمت عملی بنائی لیکن اب چھوٹے کسانوں کے لیے حکمت عملی بنانے کی ضرورت ہے۔

چھوٹے اور درمیانے درجے کے کسان ہماری زرعی معیشت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ملک میں واقع کھیتوں میں سے 94 فیصد 25 ایکڑ سے کم رقبے کے ہیں اور یہ کل کاشت کیے جانے والے رقبے کا 60 فیصد ہیں۔ 25 ایکڑ سے کم کے زمرے میں آنے والے کل کھیتوں میں سے 30 فیصد پر یا تو بے زمین ہاری کام کرتے ہیں یا پھر ملکیت رکھنے والے چھوٹے کسان (owner-cum-tanent)۔ ہاری اپنی پیداوار کا 25 سے 50 فیصد زمیندار کو زمین کے کرائے کی مد میں دینے پر مجبور ہیں، کرائے کی شرح کا انحصار اس پر ہے کہ کام کرنے والا صرف ہاری ہے یا ملکیت رکھنے والا چھوٹا کسان۔ اسی لیے کسان پیداوار بڑھانے کے طریقوں اور ٹیکنالوجی میں پیسہ لگانے کے قابل نہیں ہوتے اور نہ انھیں اس میں کوئی فائدہ نظر آتا ہے۔ پروفیسر اکمل اپنی ایک تحقیق جو کہ انہوں نے اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) کے لیے انجام دی تھی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کی تحقیق سے پتہ چلا کہ جاگیردار پر سماجی اور اقتصادی طور پر انحصار کرنے کی وجہ سے بھی چھوٹا کسان زراعت میں سرمایہ کاری نہیں کرسکتا۔ یہ انحصار کسانوں کو ان کے سرمائے سے محروم کردیتا ہے۔ اس لیے چھوٹے کسانوں کی پیداوار میں اضافہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ مزارعت کے نظام کے شکنجے سے باہر نہیں نکل آتے۔

ان کا کہنا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ریاست کی زیر ملکیت 26 لاکھ قابل کاشت اراضی کو پانچ ایکڑ کے حساب سے بے زمین کسانوں میں تقسیم کرنا ہوگی۔ اس کے مطلب ہے کہ 25 ایکڑ سے کم کے زمرے میں شامل کل کسانوں (تقریباً آٹھ لاکھ ستانوے ہزار) میں سے 58 فیصد زمین کے مالک بن جائیں گے۔ بقیہ 42 فیصد کسانوں کو قرضے لے کر زمین خریدنے کے لیے قرض کی سہولت دی جاسکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے 320 ارب روپے پر مبنی فنڈ قائم کیا جاسکتا ہے۔ پھر جن چھوٹے کسانوں کو زمین دی جائے انھیں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زمین سے فائدہ اٹھاسکیں تاکہ ان کی آمدن اور پیداور میں پائیدار اضافہ ہو۔ اس مقصد کے لیے چھوٹے کسان کے لیے ترقیاتی کارپوریشن (Small Farmer Development Corporation/SFDC) قائم کرنی ہوگی جس کے تحت 25 ایکڑ سے کم زمین رکھنے والے کسانوں کو قرضے فراہم کیے جائیں گے تاکہ وہ equity (ایکوٹی) حاصل کریں اوران کے قرضے اس کارپوریشن کے منافع کی رقم سے ادا کیے جائیں۔ کارپوریشن کے مالک چھوٹے کسان ہوں گے لیکن اس کا انتظام پیشہ ور افراد کے ہاتھ میں ہوگا۔ کارپوریشن چھوٹے کسانوں کو پیسے کے عوض خدمات فراہم کرے گی، جیسے اعلیٰ معیار کے بیج، اچھی مصنوعی کھاد، کیڑے مارادویات، پیداوار کی فروخت کے لیے مارکیٹ تک رسائی، بے موسمی سبزیاں اگانے کے لیے نئی ٹیکنالوجی جیسے tunnel farming (ٹنل فارمنگ)، آبپاشی کے پانی کے بہتر استعمال کے لیے لیزر لیولینگ اور ڈرپ (drip) آبپاشی تاکہ پانی کا موثر استعمال ہو۔ یہ اقدامات تیز اور مساوی زرعی نشوونما میں کسان کی شمولیت یقینی بنائیں گے۔

زرعی اصلاحات کی اہمیت نہ صرف زرعی نشوونما اور دیہی غربت میں کمی کے لیے ضروری ہے بلکہ پائیدار جمہوریت کے لیے بھی ضروری ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد تحمل، لیاقت (میرٹ) اور قانون کی بالادستی پر ہو وہاں پیداواری حالات، سماجی میل جول، سیاسی کلچر اور ریاستی امور میں سے جاگیردارانہ طور طریقوں کو نکالنے کی ضرورت ہے۔

(اکمل حسین، ایکسپریس ٹریبیون، 5 جولائی، 2013، صفحہ 6)

صوابی میں سبز انقلاب کے وعدے

خیبر پختونخوا کے وزیر آبپاشی و بجلی سکندر حیات خان شیرپاؤ نے کہا کہ پیہور نہر میں توسیع کے منصوبے سے 25 ہزار ایکڑ زرعی اراضی سیراب ہوگی جس سے صوابی ضلع میں سبز انقلاب آجائے گا۔ اگر صوابی کی تمام قابل کاشت اراضی کو سیراب کیا جائے تو اس سے صوبے کو گندم میں خودکفیل بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔ انھوں نے بتایا کہ اس منصوبے کے لیے رواں مالی سال کے بجٹ میں تین ارب روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ انھوں نے منصوبے کی جلد از جلد تکمیل کا وعدہ کرتے ہوئے کہا کہ ایشیائی ترقیاتی بینک نے اس منصوبے کے لیے قرضے فراہم کرنے میں دلچسپی ظاہر کی ہے، حکومت پیسہ اکٹھا کرنے کے دیگر ذرائع کی تلاش میں ہے تاکہ منصوبہ وقت پر مکمل ہو۔ سینئر صوبائی وزیر نے کہا کہ پیہور پن بجلی گھر سے اس وقت 18 میگاواٹ بجلی پیدا کی جارہی ہے۔ اس میں توسیع کے بعد بجلی کی کل پیداوار 25 میگاواٹ تک پہنچ جائے گی۔

(ڈان، 6 جولائی، 2013، صفحہ 5)

کھیت مزدور عورتوں کی کم اجرتیں

کھیت مزدور عورتیں گرم اور مرطوب موسم میں کام کرنے کے باوجود بہت تھوڑا کماتی ہیں۔ دنیا بھر میں چاول کی پیداوار کے لیے مشہور نارنگ منڈی میں چاول کے کھیت میں کام کرنے والی خاتون نوراں چنگری نے بتایا کہ ہم سورج نکلنے سے ڈوبنے تک سخت گرمی میں پانی میں کھڑے ہو کر کام کرتی ہیں، نرسریوں سے چاول کی پنیری اکھاڑ کر کھیتوں میں لگاتے ہیں لیکن ہمیں اجرت صرف 250 سے 350 روپے یومیہ ملتی ہے۔ ایک اور مزدور نسرین مصطفیٰ نے بتایا کہ زمیندار ایک ایکڑ پر کاشت کے 1800 روپے دیتے ہیں۔ ایک ہی گھرانے پر مشتمل مردوں، عورتوں اور بچوں کا 30 سے 35 مزدوروں کا ایک گروہ ایک دن میں پانچ سے چھ ایکڑ زمین پر چاول کی بوائی کرلیتا ہے۔ عورتیں گروہ بنا کر کام کرتی ہیں تاکہ بڑی عمر کے افراد اور بچوں کا بوجھ بانٹ سکیں۔

(ایکسپریس ٹریبیون، 8 جولائی، 2013، صفحہ 9)

جینیاتی فصلوں کے لیے حکومتی حمایت

وفاقی وزیر برائے غذائی تحفظ و تحقیق سکندر حیات خان بوسن نے کہا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے جدید زرعی ٹیکنالوجی کے استعمال کی ضرورت ہے تاکہ فصلوں کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ وہ کاروباری جینیاتی فصلوں کے عالمی صورت حال پر مبنی کتاب انٹرنیشنل سروس فار دی ایکوی زیشن آف ایگری بائیو ٹیک ایپلی کیشنز رپورٹ 44 (International Service for the Acquisition of Agri-biotech Applications/ISAAA Report-44) کی تقریب رونمائی سے خطاب کررہے تھے۔انھوں نے کہا کہ جینیاتی فصلیں پیداوار میں نمایاں اضافہ اور دیہی اقتصادی ترقی کی رفتار تیز کرسکتی ہیں، اس طرح ان کی مدد سے ملک میں غربت کم کی جاسکتی ہے اور غذائی تحفظ کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ وفاقی وزیر نے کہا کہ کسانوں کو بائیوٹیکنالوجی کی آگاہی دینے اور ان تک اس کے ثمرات پہنچانے کے لیے کسان مرکز حکمت عملی بنانے کی ضرورت ہے۔مستقبل میں خشک سالی پر قابو پانے کی منصوبہ بندی، نائٹروجن کے موثر استعمال اورکاشت کاری کے جدید طریقوں سے غذائی فصلوں کی غذائیت بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ملک میں خوراک اورچارے کی اچھے معیار کی اور پائیدار رسد زنجیر بنانے کی ضرورت ہے۔ سکندر حیات کا کہنا تھا کہ پاکستان ان چند ملکوں میں شامل ہے جنھیں بائیوٹیکنالوجی کی اہمیت کا احساس 1970 کے عشرے کے آغاز میں ہی ہوگیا تھا تاہم گزرتے وقت کے ساتھ اس پر عمل درآمد کی رفتار کم ہوگئی۔

(ایکسپریس ٹریبیون، 9 جولائی، 2013،صفحہ 11)

سیلاب سے خریف کی فصل تباہ

پنجاب میں مون سون کی بارشوں سے آنے والے سیلاب نے 78 ہزار 500 ایکڑ پر کھڑی خریف کی فصل کو تباہ کردیا۔سیلابی پانی کی وجہ سے شمال میں نارووال اور سیالکوٹ اور جنوب میں راجن پور اور ڈیرہ غازی خان میں چاول اور کپاس کی فصلیں برباد ہوگئیں۔ ابتدائی اطلاعات کے مطابق صرف ضلع راجن پور میں 70 ہزار ایکڑ اورڈیرہ غازی خان میں 3500 ایکڑ پر پھیلی ہوئی کپاس کی فصل تباہ ہوئی۔جام پوراور روجھان مزاری سب سے زیادہ متاثر ہونے والے اضلاع تھے۔ نارووال میں پانچ ہزار ایکڑ پر چاول کی فصل زیرآب آگئی، اس میں سے کچھ فصل کے بچنے کا امکان ہے۔

سیلاب زدہ علاقوں میں باغات اورمویشیوں کے چارے کوبھی نقصان پہنچا۔

(دی نیوز، 17 اگست، 2013،صفحہ 15)

پاکستان زرعی صنعت کوفروغ دے: ایشیائی ترقیاتی بینک

ایشیائی ترقیاتی بینک نے کہا کہ پاکستان میں لوگوں کو روزگار فراہم کرنے میں زراعت کاحصہ کافی بڑا ہے، پاکستان کوصنعت اورخدمات کے شعبوں کوفروغ دینا چاہیے تاکہ لوگوں کو روزگار ملے۔ساتھ ساتھ دیہی علاقوں میں صنعت کاری بھی کرنی پڑے گی۔

اپنی نئی رپورٹ میں ایشیائی ترقیاتی بینک نے کہا کہ ایشیاء کے بیشتر ممالک میں خدمات، روزگار فراہم کرنے والا سب سے بڑا شعبہ بن جائے گا۔ خطے کے ممالک بالخصوص بنگلہ دیش،چین، بھارت، پاکستان اور تھائی لینڈ کوصنعت اور خدمات کے شعبوں کوترقی دینے کی ضرورت ہے۔

رپورٹ کے مطابق کل پیداوار میں زراعت کا حصہ نمایاں طور پر کم ہوا ہے، زراعت اب بھی وہ شعبہ ہے جوسب سے کم پیداوار دیتاہے۔ملازمت کی فراہمی میں زراعت کا حصہ بھی کم ہوگیا ہے تاہم اب بھی یہ شعبہ 70 کروڑ افراد کو روزگار فراہم کررہا ہے یا دوسرے الفاظ میں ایشیاء میں کل ملازمتوں کا 42.82 فیصد فراہم کررہا ہے۔

بہت سی ایشیائی معیشتوں نے اپنی صنعتی پیداوار میں بہت اضافہ کیا ہے۔کل ملازمتوں میں صنعت کا حصہ دیکھا جائے تو ایشیاء کی اعلیٰ درجے کی معیشتیں صنعتی بن گئی ہیں تاہم بیشتر دوسری معیشتیں اس عمل سے نہیں گزریں۔

بعض ایشیائی معیشتوں نے صنعت کاری کو پوری طرح نہیں اپنایا اور ان کا رسد کا نظام کمزور ہے، نتیجتاً ان کے اقتصادی ڈھانچے کی بنیادیں کمزور ہیں۔

مجموعی ملکی پیداوار (Gross Domestic Product/GDP) کے حساب سے دیکھا جائے تو ایشیاء خدمات فراہم کرنے والا خطہ ہے تاہم اس کا خدمات کا شعبہ متنوع ہے کیوں کہ یہاں کم پیداوار والی روایتی اور زیادہ پیداوار والی جدیدخدمات دونوں فراہم کی جاتی ہیں۔

بہت سے ایشیائی ممالک میں بنیادی ڈھانچے کی تبدیلی زراعت سے خدمات میں منتقلی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ منتقلی زراعت سے خدمات کے کم پیداواری ذیلی شعبے میں ہوتی ہے۔

رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے کہ ترقی پذیر ایشیاء کے بنیادی ڈھانچوں میں حقیقی اور تیزرفتار تبدیلی کی ضرورت ہے اوراس بات کی بھی ضرورت ہے کہ افرادی قوت کوکم پیداواری شعبوں سے زیادہ پیداواری شعبوں میں منتقل کیا جائے۔

(ڈان، 22 جولائی، 2013،صفحہ 9)

بیجوں کی تباہی

جیسے جیسے دنیا میں جینیاتی فصلوں کی پیداوار کی مکمل پابندی کا مطالبہ بڑھتا جارہا ہے، اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ایسی بین الاقوامی کمپنیاں جو ان قابل اعتراض بیجوں اور اس سے جڑے دیگر مصنوعات کی پیداوار اور مارکیٹنگ کرتی ہیں، اچانک پاکستانی کسانوں کو برباد کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہیں۔

ان کمپنیوں کے لیے یورپی ممالک کے ساتھ ساتھ زیادہ تر جنوبی امریکی ممالک، روس اور دیگر کئی ملکوں کی منڈی پر پابندی عائد ہے۔ بھارت کا بھی کچھ ایسا

ہی رجحان ہے۔ کمپنیاں بشمول مونسانٹو اور سینرجن (Synergen) (پاکستانی) ماحولیات کی وزارت کے قومی بائیوسیفٹی کمیٹی پر جینیاتی فصلوں کی پرکشش منڈی تک مکمل اور بلا روک ٹوک رسائی کے حصول کے لیے مبینہ طور پر دباؤ ڈال رہی ہیں۔

جی ایم اوز کی جارحانہ مارکیٹنگ کے ذریعہ دنیا کی خوراک کی ترسیل/فراہمی پر قبضہ کی جنگ۔ ایسی بیج کے ذریعہ جو ہر سال منڈی سے لازمی خریدنی ہوگی آنے والے مہینوں میں انتہائی تباہی کی نوید ہے۔ ایسے کئی حربے استعمال کیے جارہے ہیں کہ تجارتی اور نجی استعمال کے لیے فصل کاشت کرنے والوں کا روایتی بیجوں کے استعمال کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے کیونکہ یہ بیج اگلے سیزن کے لیے دوبارہ مفت استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایسے اقدامات سے مزید مسائل میں اضافہ ہی ہوگا۔ امریکہ میں مظاہرین جینیاتی فصلوں کو زمینوں سے نکال کر پھینک رہے ہیں اور جلا بھی رہے ہیں۔ خبروں کے مطابق مونسانٹو اپنے تجارتی مفاد کی حفاظت کے لیے نجی آرمی میں بہت زیادہ سرمایہ کاری کررہا ہے۔

روس کے وزیر اعظم ولادیمیر پوٹن نے سختی سے مونسانٹو پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ ''ان کو روکنے کے لیے ایک جنگ'' کی ضرورت پڑے لیکن دوسری طرف افسوس ہے کہ پاکستان میں کپاس کی لابی اس کوشش میں مصروف ہے کہ پاکستان میں جتنی جلدی ممکن ہو جینیاتی کپاس کی کاشت شروع کی جائے۔ اس کی ایک وجہ جینیاتی کپاس کی زیادہ پیداوار اور اس پر آنے والے کم اخراجات بتائے جاتے ہیں، کیونکہ اس میں پہلے سے ہی کیڑے مار زہر شامل ہوتا ہے۔ ان حالات میں دیکھنا ہے کہ کیا کسانوں کا چاول کی کاشت کی طرف بڑھتا ہوا رجحان تبدیل ہوکر واپس (کپاس کی طرف) آتا ہے کہ نہیں؟

پاکستان میں کسی ایک بھی جینیاتی فصل کی اجازت ایک بڑی تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ بہتر ہوگا کہ قومی بایوسیفٹی کمیٹی بھارتی پنجاب میں جینیاتی فصلوں سے زرخیز زمینوں کی بربادی اور ہزاروں کسانوں کا قرض کے بوجھ تلے خودکشی جیسے واقعات کا جائزہ لے۔

(زہرہ ناصر ''سیڈز آف ڈوم''، ایکسپریس ٹریبیون، 6 اگست، 2013، صفحہ 6)

رخ زمانہ

بیج کی خرید وفروخت کے لیے نئی یورپی قانون سازی خوراک کی جمہوریت کے لیے خطرہ

یورپی شہریوں کے ایک گروپ نے ''شہریوں کے اعلامیہ'' کے نام سے ایک اعلامیہ جاری کیا جس میں روایتی بیج کے خلاف نئے یورپی مجوزہ قوانین کی مزمت کی گئی۔ اعلامیہ میں کہا گیا کہ بیج ایک مشترکہ شے اور قدرت کا تحفہ ہے۔ یہ تحفہ دنیا بھر کے کسانوں کی صدیوں کی سخت محنت کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے بیج منتخب اور محفوظ کیے اور اس کی نسلوں کو آگے بڑھایا۔ بیج زندگی کا ذریعہ ہے اور ہماری خوراک کی زنجیر کی پہلی کڑی ہے۔

ہم سب کی یہ مشترکہ شے آج خطرے سے دوچار ہے۔ پچھلی چند دہائیوں سے جب صنعتی طریقہ زراعت حاوی ہوا ہے، یورپی قانون سازی نے بیج تک رسائی مشکل بنا دی ہے۔ صرف ایسے بیج کی اقسام جو صنعتی طریقہ زراعت کے لیے موزوں ہیں یورپی منڈی میں فروخت کی جاسکتی ہیں۔

بیجوں کی رجسٹریشن کے پیچیدہ طریقہ کار اور مہنگے ٹیسٹ میں کامیابی لازمی قرار دی گئی ہے اور اس کی کاشت کیمیائی اشیاء کی مرہون منت ہے۔ اس طرح کی قانون سازی سے بیجوں کے تنوع میں ڈرامائی کمی واقع ہوئی ہے جو کہ تحفظ خوراک کے لیے سنگین خطرہ ہے۔ بیج اب کسانوں اور باغبانوں کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ مٹھی بھر بین الاقوامی کمپنیوں نے بیج کی منڈی کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ صرف چھ بین الاقوامی کمپنیوں کا نجی شعبے میں افزائش نباتات (plant breeding) کی تحقیق پر 75 فیصد، بیج کی خرید وفروخت پر 60 فیصد اور عالمی زرعی و کیمیائی فروخت پر 75 فیصد قبضہ ہے۔

یورپی کمیشن کی نئی قانون سازی سے مزید بگاڑ کا خدشہ ہے جس کے تحت کسانوں کی بیج تک مفت رسائی اور زرعی تنوع حیات کو مزید محدود کیا جارہا ہے اور بین الاقوامی کمپنیوں کو بیج کی منڈی پر خصوصی اختیارات دینے میں مدد فراہم کی جارہی ہے۔ دوسری طرف ایسے بیجوں کا جو وسیع پیمانے پر کیڑوں سے بچاؤ اور بدلتی ہوئی موسمی تبدیلیوں سے نمٹنے کی مدافعت رکھتے ہیں، منڈی سے خاتمہ یا انھیں محدود کیا جارہا ہے۔ اس قانون سے نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا متاثر ہوگی۔ بیج پر اجارہ داری کے اس قانون کو ہم مسترد کرتے ہیں۔

(Seed Freedom. "New European legislation on the "Marketing of seeds" is a threat to Food Security and Democracy," 2 October, 2013, accessed from http://www.seedfeedom.eu/)

امریکہ میں جینیاتی فصلوں سے بنی غذاؤں کی غیر نامقبولیت

امریکہ کی دو درجن سے زائد ریاستوں میں جینیاتی فصلوں سے تیار کردہ خوراک کے ڈبوں پر شناختی لیبل چسپاں کرنے کے لیے قانون سازی کی جارہی ہے۔ امریکی صارفین میں جینیاتی فصلوں سے بنی غذاؤں کی نامقبولیت کے بعد خوراک کی کمپنیاں اب اپنی مصنوعات کو غیر جینیاتی فصلوں سے تیار کرکے صارفین کو فروخت کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کررہی ہیں۔ غیرجینیاتی فصلوں کی مانگ میں اضافے کے بعد محدود پیمانے پر دستیاب ان فصلوں کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔

رواں ہفتے جینیاتی فصلوں سے تیار کی گئی غذاؤں کے خلاف پوری دنیا میں احتجاجی جلوس نکالے گئے اور صارفین نے ان غذائی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی جن پر شناختی لیبل چسپاں نہیں ہوتا۔

امریکہ میں قدرتی فصلوں کی محدود پیداوار کے باعث غذائی کمپنیوں کو اب قدرتی غذائی اجزاء کے حصول میں شدید دشواری پیش آرہی ہے۔ غذائی کمپنی تھنک تھن (Think Thin) کی مثال سامنے ہے جس نے اپنے کھانوں کے سب سے بڑے خریدار ''ہول فوڈز مارکیٹ (Whole Foods Market)'' کی مانگ پوری کرنے کے لیے غیر جینیاتی غذائی اجزاء کی سپلائی کرنے والوں کی تلاش شروع کی۔ اس تلاش میں کمپنی کو اٹھارہ ماہ لگ گئے۔

امریکہ کی چار بڑی فصلوں مکئی، سویابین، کینولا اور شوگر بیسٹ (چقندر کی ایک قسم جس سے شکر تیار کی جاتی ہے) کی 90 فیصد پیداوارجینیاتی بیجوں سے حاصل کی جاتی ہے، جس کا مطلب ہے کہ غذائی کمپنیوں کے لیے زیادہ پیداوار والی (conventional) بیجوں سے اگائی گئی فصلوں سے غذائی اجزاء کا حصول ایک چیلنج ہوگا۔

مال مویشی کے شعبے میں بھی غیرجینیاتی فصلوں کی مانگ بڑھتی جارہی ہے کیوں کہ صارفین اب ان جانوروں کا گوشت اور انڈے کھانا چاہتے ہیں جنھوں نے کبھی بھی جینیاتی فصلوں سے حاصل کی گئی خوراک نہ کھائی ہو۔

25 مئی 2013 کو 52 ممالک کے 436 شہروں میں تقریباً 20 لاکھ افراد نے ''مونسانٹو کے خلاف مارچ'' کے نام سے جینیاتی بیج اور کیڑے مار ادویات بنانے والی کمپنی مونسانٹو اور جینیاتی غذاؤں کے خلاف احتجاجی جلوس نکالے۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 28 مئی، صفحہ 15)

تجزیہ

پاکستانی اور بین الاقوامی حالات کا سرسری جائزہ بھی اس حقیقت کو ابھارتا ہے کہ پہلی دنیا کی نیولبرل یا آزادتجارت پر مبنی پالیسی سازی کو ہر سطح پر نافذ کرنے کے انتظامات کیے جارہے ہیں۔ پاکستان میں اس وقت صنعتی زراعت کو فروغ دیا جارہا ہے جس کے تحت تمام تر توجہ پیداوار بڑھانے پر ہے، جس میں خاص طور سے مال مویشی کا شعبہ اور اجناس کی پیداوار شامل ہیں۔ پیداوار میں اضافہ عوام کی خوشحالی کے لیے نہیں بلکہ پیداوار کو ملک سے باہر بین الاقوامی منڈی تک پہنچانے کے لیے کی جارہی ہے۔

مزدور کسان کی بدحالی تو واضح ہے۔ اسے شدید محنت کی اجرت نہ وقت پر دی جاتی ہے اور نہ ہی اتنی دی جاتی ہے کہ وہ انسانی وقار قائم رکھتے ہوئے ایک بہتر زندگی گزار سکے۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنے ساتھ جو ماحولیاتی بگاڑ لاتا ہے اس کی تباہی بھی کسان مزدور جھیلتا ہے۔

حد تو یہ ہے کہ جو پالیسی سازی بظاہر کسان کے فائدہ کے لیے کی جارہی ہوتی ہے اس میں بھی سرمایہ دار کا فائدہ اور اس کے مفاد کو فروغ دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر زمین کے بٹوارے کو تسلیم تو کیا جارہا ہے لیکن اس کے پیچھے اصل مقصد جدید ٹیکنالوجی پر مبنی مشینری اور زرعی مداخل کے لیے منڈی کو قائم کرنا اور بڑھانا ہے۔ ایسے اقدامات سے لگتا ہے کہ جاگیرداری کو کمزور کرنے کی طرف اقدام اٹھائے جارہے ہیں لیکن غور کریں تو ایسا نہیں ہے۔ صرف سرکاری زمین کے بٹوارے اور فروخت کا ذکر ہے۔ جاگیردار کے پاس جو بڑے پیمانے پر زرعی زمین ہے اس کے بٹوارے کی طرف اشارہ تک نہیں۔

صنعتی زراعت کی خاص توجہ ہائبرڈ اور جینیاتی بیج کے فروغ پر ہے۔ ہر ممکن کوشش ہے کہ کسان روایتی کھیتی باڑی کو دقیانوسی طریقہ پیداوار سمجھتے ہوئے صرف بین الاقوامی کمپنیوں کے تیار کیے گئے مہنگے ترین بیجوں کو ہر مسئلہ کا حل سمجھیں۔ ان اقدامات کے لیے مونسانٹو جیسی کمپنیاں ناصرف پاکستان بلکہ اپنے ملک میں بھی منافع خوری کے لیے قانون سازی میں دخل اندازی کررہی ہیں۔ دوسری طرف سرمایہ دار ممالک کے عوام قدرتی طریقہ زراعت سے حاصل کردہ خوراک کو ترجیح دیتے ہیں۔ اب وہاں کا سرمایہ دار ان کی ''خالص غذا'' کی مانگ کے حصول کے لیے کوشش بھی کررہا ہے تو اپنے ہی جال میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ بلاشبہ قدرتی غذا بھی ان کے لیے ایک منافع بخش منڈی ہے لیکن اب اس منڈی کو چمکانے کے لیے قدرتی وسائل ناپید ہوگئے ہیں۔

پاکستان اور پاکستان جیسے زرعی ممالک کے لیے اب بھی موقع ہے کہ وہ پہلی دنیا کے سرمایہ دار ممالک کے حالات کو دیکھتے ہوئے سنبھل جائیں۔ جن بیش بہا بچے کھچے قدرتی بیج اور دیگر انمول قدرتی ذخائر کو ہمارے کسان و مزدور سنبھال پائے ہیں، ان کی قدر کرتے ہوئے ان کو فروغ دیں اور سرمایہ داری کے منافع خوری پر مبنی اندھے کنویں کے کنارے سے اپنے آپ کو واپس کھینچ لیں۔